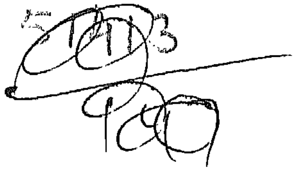


1081

NATIONAL PRESS URDU LITERATURE SERIES N

اشعارِ میر

از

عبدالمنان صاحب بیدل۔ ایم۔اے عظیم آبادی

پروفیسر گورنمنٹ کالج پٹنہ

ناشر

لالہ رام نرائن لعل بکسیلر

الہ آباد

۱۹۴۷ء

قیمت ۱۲/

بارِ دوم

منذرجات

میں کون ہوں اے ہم نفساں؟ سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

تکلیف نہ دو تم اے! مجھے جنبشِ لب کی
میں صاحبِ سخنِ آشفتہ مجنوں نہ زباں ہوں

ہوں زردِ غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغِ خزاں دیدہ میں میں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
درپئے نہ ہوا اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

دیکھا ہے مجھے جس نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں

اپنی صوری تصویر اپنے ہاتھ سے کھینچنا اپنا آپ فوٹو لینے سے کہیں دشوار ہے مگر اپنی معنوی صورت، اپنے جذبی کوائف کی تصویر کاغذ پر اپنے قلم سے کھینچ کر رکھ دینا انہی مصوروں کو نصیب ہوا کرتا ہے جو اپنے نفسی کوائف کی جلوہ گاہ میں محوِ نظارہ ہوں۔ ملاحظہ ہو:-

میر صاحب اپنی طبیعت کی روانی، اپنی جوانی اور کیسی جوانی۔ دردمند، اشک فشاں، دیوانہ مزاج، صحرا نورد اور پراگندہ خاطر جوانی، اپنی مرثیہ گوئی، اپنی دلی، اپنی سحر بیانی اور ابنائے زمانہ کی ناقدری کی جیتی جاگتی تصویر یوں کھینچتے ہیں:-

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

منہ تو بوچھار کا دیکھا ہے بہت تم نے
اسی انداز کی تھی اشک فشانی اس کی

کر کے تعویذ رکھیں اس کو بہت بھاتی ہے
وہ نظر پاؤں پہ وہ بات دوانی اس کی

خاطر بادیہ سے دیر میں جائے گی کہیں
خاک مانند بگولے کے اڑانی اس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی

اب گئے اس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

دوسری جگہ میر صاحب اپنی جوانی کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:-

جنوں کا شیفتہ میرے مذکور ہے
جوانی دوانی ہے مشہور ہے

یاد پڑتا ہے جوانی تھی کہ آئی زندگی
ہو گیا ہوں میں تو دست عشق شیاری سے تنگ

اسی جوانی سے وابستہ اُن کی اپنے عشق اور اُس کی کارفرمائی کی تصویریں ہیں۔ فرماتے ہیں :-

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا

پوچھو تو میرؔ سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
چہرہ اُترا رہا ہے کچھ آج اُس جوان کا

ہر چند ضبط کیجیے چھپتا ہے عشق کوئی
گزرے ہے دل پہ جو کچھ چہرے ہی سے عیاں ہے

نام اُس کا سن کے آنسو گر ہی پڑے ٹپک کے
دل کا لگاؤ یارو چھپتا نہیں چھپایا

عشق کے اثرات - از خویش رفتگی :-

از خویش رفتہ اُس بن رہتا ہے میرؔ اکثر
کرتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

بے اختیاری :-

مانند شمع مجلس شب اشک بار پایا
القصہ میرؔ ہم کو بے اختیار پایا

پراگندگیٔ طبع :-

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

دیوانگی کی علامت اور اس کی حقیقت :-

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ — کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانا تھا

شوق :-

جیسے گرداب ہے گردش مری ہر جا پہ نظر — شوق کیا جانیے لیے مجھکو کدھر جاتا ہے

محزونی :-

اور محزوں بھی ہم سنے تھے ولے — میر سا ہو سکے ہے کب کوئی!

بیخودی :-

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا

شکلِ تصویرِ بیخودی کب تک — کسو دن آپ میں بھی آئیے گا؟

میر بیخود جو ہیں سو کیا جانیں — اپنے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں؟

جیسے بجلی کے چمکنے سے کسو کی نیند اچٹ جائے — بیخودی آئی اچانک میرے آ جانے سے

درد مندی :-

ہمیشہ چشم ہے نمناک، ہاتھ دل پر ہے — خدا کسو کو کہیں ہم سا درد مند کرے!

کیا جانیے کہ عشق میں خوں ہو گیا کہ داغ — چھاتی میں اب تو دل کی جگہ ایک درد ہے

آرزو :-

دل پھر دلبروں سے پیار کرنے کو چلا　　کچھ انتہا نہیں ہے عاشق کی آرزو کو

بیچارگی :-

کیا کیجئے کہاں کہیں دل نذر دیا کر اپنا　　دل نہ اپنا ہے محبت میں نہ دلبر اپنا

انتظار :-

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی اُدھر سے آوے گا
یا کہ نوشتہ اُن ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاوے گا

ابتری حال :-

دیکھئے کیا ہو مآل کہ اب حال ہمارا ابتر ہے　　دل اپنا تو بجھا سا ہے جیسے چراغ مضطر

درد کو ناچار چھپانا :-

ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر　　درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

شکایت :-

کیا پوچھتا ہے ہم سے کوئی گردش سے دیکھتا ہے　　اک آگ لگ اٹھے ہے اپنے تن بدن میں

ناگوار زندگی :-

بیٹھا ہے زندگی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا　　بیٹھے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

فراق کا دکھ :-

یا رب اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا
پھر اُس پہ ظلم یہ ہے کچھ کہا نہیں جاتا

ناامیدی :—

رہا تھا کچھ اور ہی میر چلتے
عجب اک ناامیدی تھی نظر میں

ناامیدانہ فریاد :—

سنتے ہو تو اب سن لو کہ پھر ہم بعد
نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد

خستہ جانی :—

سر کیا آہ دل شرحِ خستہ جانی کی
میر نے مر کے زندگانی کی

غم :—

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

رکھتے ہیں دل پہ ہاتھ لیے میر
یہیں شاید کہ ہے سب غم ہمارا

نامرادی :—

نامرادی کی رسم میر سے ہے
طور یہ اس جوان سے نکلا

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

خواری :—

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

محرومی :—

ایک محروم چلے میر ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

حیرانی :-

تصویر سے دروازے پہ ہم اس کے کھڑے ہیں
انسان کو حیرانی بھی دیوار کرے ہے

رونا :-

یہ حال بے سبب تو ہوتا نہیں ہے لیکن   رونے کا لمحہ ظاہر سبب نہیں کچھ
چشم سے خوں ہزار نکلے گا   کوئی دل کا بخار نکلے گا
کیا فرض ہستی کی رخصت ہے تجکو   کہیں اپنے رونے سے فرصت ہے مجکو

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش   گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے
شرر سے اشک ہیں اب چشم تر میں   لگی ہے آگ اک میرے جگر میں

سوکھتے ہی آنسوؤں کے نور آنکھوں کا گیا
بجھ ہی جاتے ہیں دیئے جس وقت سب روغن جلا
ہو سکتی ہیں سدرہ، پلکیں کہیں رونے کی
تنکوں سے رکے ہے کب، دریا جو بہا چاہے
آگے دریا تھے دیدۂ تر میر   اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

بیدماغی اور کم اختلاطی:۔

میر کس کو اب دماغ گفتگو　　عمر گذری ریختہ چھوٹا گیا

کس طور اتفاق پڑے صحبت اُس سے دیہہ

ہے میر بے دماغ و قیامت کم اختلاط

گرفتہ دل ہوں سرِ ارتباط مجکو نہیں　　کسو سے شہر میں کچھ اختلاط مجکو نہیں

عشق اور اُس کی کار فرمائی نے میر صاحب کا جو حال بنایا اُس کی تصویر ملاحظہ ہو چکی۔ اب یہ سُننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُن کا معشوق کہاں کا تھا اور کیسا تھا۔ سُنئے۔

کہاں کا تھا:۔

خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے　　معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا

کیسا تھا:۔

اُس شوخ نے سُنا نہیں نامِ صبا ہنوز

غنچہ ہے وہ لگی نہیں اُس کو ہوا ہنوز

بیمار رہی ہیں اُس کی آنکھیں　　دیکھو کسو کی نظر نہ ہووے

میر اُن نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

لب:۔

تبسم سحر ہے جب پان سے لب سُرخ ہوں اُس کے

دلوں میں کام کر جاتا ہے یاں جادو کے تیروں کا

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

منہ :-

یوں عرق جلوہ گر ہے اس منہ پہ — جس طرح اوس پھول پر دیکھو

زلف :-

دم نہ لے اس کی زلفوں کا مارا — میر کاٹا جیے نہ کالوں کا

وہ آپ روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا — سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا

شوخی :-

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھ کو تو ہنسی سے — پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے

میں تو چپ ہوں وہ ہونٹھ چاٹے ہے — کیا کہوں ریجھنے کی جا ہے یہ

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے

نگاہ :-

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا — دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا

اس کی طرز نگاہ مت پوچھو — جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

پڑتے ہی نگہ یار مرا حال ہے ویسا　　بجلی کے تڑپنے سے کوئی جیسے کہ ڈر جائے

ادا:-

گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میر　　اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

انداز و ناز:-

بلا انداز ہے اس کا، قیامت ناز ہے اس کا
اٹھے فتنے ہزار اس سے ہوئے آباد فساد اس سے

سراپا:-

سراپا میں اس کے نظر کر کے تم　　جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے

جمع خوباں میں مرا محبوب اس مانند ہے　　جوں ستارہ [illegible]

میر صاحب کا معشوق کے آتے ہی کیا حال ہوا-

ٹھہرا گیا ہو ٹک بھی تو تم سے بیاں کروں
آتے ہی اس کے رفتن صبر و سکوں ہوا

آنے میں اس کے حال ہوا جائے ہے بغیر　　کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا

رخصت معشوق:-

اس کے گئے پر ایسے گئے دل سے ہم نشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

میر صاحب جب اپنے معشوق سے ملتے ہیں تو کیا حال ہوتا ہے:-

آ اپنے دل میں حال بہ اپنا بھلا کہوں　　پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
کتنی باتیں بنا کے لاؤں ایک — یاد رہتی ترے حضور نہیں
کہتے تھے اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے لیک — وہ آگیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات

کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے کو آجاتا ہوں — دل کی پھر دل ہی میں لیے چپکے چلا جاتا ہوں

مخاطبات اور چھیڑ چھاڑ :-

[illegible] — کوئی تو چاہیے [illegible] نیاز کرنے کو
ستم ہیں ہماری قسمت نصیب میں — کرو حسرت جتنا کرو مقدور ہے
تم نے تو ادھر دیکھنے کی کھائی ہے سوگند — اب ہم بھی لڑا بیٹھے ہیں آنکھ کسی سے
حسن اے رشک مہ نہیں رہتا — چار دن کی ہے چاندنی یہ بھی
صد گونہ عاشقی میں ہم نے جفا سہی ہے — پھر یہ کہا نہ ظالم اس کی نہیں سہی ہے
کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے — مدعا ہم کو انتقام سے ہے
کچھ سمجھتے نہیں ہمارا حال — تم سے کچھ اے بتاں خدا سمجھے

رخصت :-

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
وعدے سے ہر روز رہے ہیں اور تم آتے ہی نہیں — ہم کو دیکھو کہ لگے چلنے تو جانے ہی رہنا
آنے کے وقت تم تو کہیں رکتے نہیں رہتے — اب آکے تم تو ذرا ٹھہرو ہم ہی نہیں رہتے

معشوق سے خیالی گفتگو:-

بیٹھنے کون دے ہے پھر اُس کو — جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے
خانۂ دل سے زینہار نہ جا — کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

صحبت معشوق:-

جب کہ پہلو سے یار اُٹھتا ہے — درد بے اختیار اُٹھتا ہے

رات مجلس میں ترے ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

تصویر سے دروازے پہ ہم اُس کے کھڑے ہیں
انسان کو حیرانی بھی دیوار کرے ہے

میر صاحب کے عشق اور اُس کی کارفرمائی کی داستان میر صاحب ہی کی زبانی کہی جا چکی۔ اُن کے معشوق سے بھی اُن ہی کے موقلم کی تصویر کشی کی بدولت تعارف ہو چکا۔ اب وہ خود اپنی شاعری کی ابتدا اور انتہا آپ کو کہہ سُناتے ہیں۔ ناکامیٔ عشق نے دل گداز کر دیا ہے۔ پہلے تو ایک معشوقِ خیالی سے عشق کرتے ہیں اور میدانِ تخیل میں سرگرداں رہ کر پھر معشوقِ حقیقی تک جا پہنچتے ہیں۔ سُنئے اور غور سے سنئے پڑھئے اور دل لگا کر پڑھئے:-

دل گدازی:-

کہتے نہ تھے میر مت کُڑھا کر — دل ہو نہ گیا گداز تیرا

مانندِ شمع ٹپکے ہی پڑتے ہیں اب تو اشک
کچھ جلتے جلتے ہو گئے ہیں ہم گداز سے

زخمِ دل :-

ہیں گھاؤ دل پہ اپنے تیغِ زباں سے اسکی   تب درد ہے ہمارے اے میرؔ ہر سخن میں

سرگذشت :-

سرگذشت اپنی سبب ہے حیرتِ احباب کی
جس سے دل خالی کیا وہ آہ بھر کر رہ گیا

گرمیٔ عشق :-

گرمیٔ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی   میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

دل سوختگی :-

دل سوختہ ہوں مجکو تکلیف حرف ست کر
اِک آگ کی لپٹ سی نکلے ہے ہر سخن سے

رُلانے کی تیاری :-

شعر کیے موزوں تو ایسے جن سے خوش ہیں صاحبِ دل
روئیں کڑھیں جو یاد کریں۔ اب ایسا کچھ تم میرؔ کرو

رونے کی تاثیر :-

یا روئے یا رُلایا اپنی تو یوں ہی گذری   کیا ذکر ہمصفیراں یارانِ شادماں کا
ہمیشہ رونا کڑھنا سینہ کوبی ہر زماں کرنا   عزا خانہ کیا۔ دل کے مرے ماتم نے دنیا کو

میر صاحب رُلا گئے سب کو　　　کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

جب نالہ کش ہوا وہ تب محفلیں رُلائیں　　　تھا میر دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں　　　ماتم زدہ میر اگر نہ ہوگا

تخیلی شاعری

عالم خیال۔ معشوق خیالی :۔

خلاف ان اور خوباں کے سدا یہ جی میں رہتا ہے
یہی تو میر اک خوبی ہے معشوقِ خیالی میں

دل کی آگ ہو تو جینے کا لطف ہے :۔

آگ اگر دل کو نہیں، لطف نہیں جینے کا
اُلجھے سُلجھے کسو کاکل کے گرفتار رہو

اپنی حالتِ گذشتہ پر ایک نظر :۔

کیا میں بھی پریشانیِ خاطر سے قریں تھا　　　آنکھیں تو کہیں تھیں، دلِ غمگیں کہیں تھا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

جوانی پر افسوس و حسرت :-

اب جو اک حسرت جوانی ہے　　عمر رفتہ کی یہ نشانی ہے
دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا　　جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا

جبر و اختیار :-

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے جو ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

معشوق سے خیالی گفتگو :-

فلک نے آہ تری رہ میں ہم کو پیدا کر　　برنگ سبزۂ نورستہ پائمال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو　　چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا
کس دل سے ترا تیر نگہ پار نہ گذرا　　کس جان کو یہ مژدہ کا پیغام نہ آیا
یہ زخم جگر داور محشر سے ہمارا　　انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا
ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے　　کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

تو وہ متاع ہے کہ پڑی جسکی تجھ پہ آنکھ　　وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا
گل و بلبل بہار میں دیکھا　　ایک تجھکو ہزار میں دیکھا

تا بمقدور انتظار کیا　　دل نے اب زور بے قرار کیا
دشمنی ہم سے کی زمانے نے　　کہ جفاکار تجھ سا یار کیا

گل پر تخیل

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

چمن کی وضع پر تخیل :-

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ　　کہ ہر غنچہ دل پُر آرزو تھا

آئینہ پر تخیل :-

مُنہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا　　حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

دل پر تخیل :-

سب کھلا باغ جہان الاّ یہ حیران وخفا　　جسکو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

دل نے ہم کو مثال آئینہ　　ایک عالم کا روشناس کیا

دل کی چاہ پر تخیل :-

گذرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا　　خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

پہلے پہل جو عاشق ہوا اُس پر تخیل :-

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر　　مذہب عشق اختیار کیا

روزگار پر تخیل :-

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے　　اُن کو اس روزگار میں دیکھا

مجاز سے سلوک کی طرف رُخ

تھا مستعار حُسن سے اُس کے جو نور تھا　　خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا
ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک — سر سے سودائے جستجو نہ گیا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا — نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا
گل و آئینہ کیا، خورشید و مہ کیا — جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

عام انسان سے مخاطبت اور تعلیم حقائق :-

مر گیا جو اسیر قید حیات — تنگنائے جہاں سے نکلا

دنیا دھوکا ہے :-

دھوکا ہے تمام بحر دنیا — دیکھے گا کہ ہونٹھ تر نہ ہوگا

یہ توہم کا کارخانہ ہے — یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اپنے نفس کا عرفان :-

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں — مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

اگرچہ سہل ہیں پہ دیدنی ہیں ہم بھی میر — ادھر کو یار تامل سے گر نگاہ کریں

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر — دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

عشق اور مذہب :-

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اُسکے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا -

اسلام :-

بت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں — معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا
کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے — حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

تعلی - اُستادی و شہرت :-

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں شاعروں میں میر — پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر — سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا
میر شاعر بھی اور کوئی تھا — دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب
دیوان میر صاحب ہر اک کے ہے بغل میں — دو چار شعر اُن کے ہم بھی لکھا کریں گے

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں — وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

ہمعصروں سے معارضہ

اس فن کے پہلوانوں سے کشتی رہی ہے میر — بہتوں کو ہم نے زیر کیا ہے پچھاڑ کر
گفتگو ناقصوں سے ہے ورنہ — میر جی بھی کمال رکھتے ہیں

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی — گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

نہ رکھو کان نظم شاعران حال پر اتنا — چلو ٹک میر سے پوچھو کہ وہ موتی پروتا ہے
سمجھے انداز شعر کو میرے — میر کا سا اگر کمال رکھے
گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے
اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض — اول تو میں سند ہوں پھر میری یہ زباں ہے

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں — یونہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

منہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ — گویا کہ میر محو ہیں میری زباں کے لوگ

سخن یہی ہے، جو کہتے ہیں شعر میر ہے سحر — زبان خلق کو کس طور کوئی بند کرے

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا — ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے
نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے — ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

دکن تک اثر پہنچا ہے

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر — یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا
سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ — ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہیں میرے ریختوں کا دوانہ دکن تمام

شاگردوں اور متاخرین پر اثر

میر و راسخ

۱ جز مرتبہ کل کو حاصل کرے ہے آخر — یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

دیکھیے اس شعر نے میر صاحب کے شاگرد رشید حضرت راسخ علیہ الرحمۃ سے یہ شعر کہلوایا۔

تربیت وجہ ترقی ہے جو ہو استعداد
قابلیت ہو تو پھر قطرہ بھی دریا ہووے

میر صاحب فرماتے ہیں۔

کتنی باتیں بنا کے لاؤں ایک — یاد رہتی ترے حضور نہیں
کہتے تھے اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہیے لیک — وہ آگیا تو سامنے اسکے نہ آئی بات

راسخ فرماتے ہیں:۔

بھلا کہو کہیں ایسے سے اپنا کیونکر حال — کہ جب وہ سامنے ہو طاقت بیاں نہ رہے

میر صاحب فرماتے ہیں:۔

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر — کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

راسخ مثنوی ناز و نیاز میں کہتے ہیں۔

مت کرو عشق کا دعویٰ راسخ — عشق تم کو نہیں زیبا راسخ
رنج کش عشق کے کب ہو صاحب — تم تو آرام طلب ہو صاحب

سایہ ہی ڈھونڈھو ہو سونے کے لئے   دل خوش چاہو ہو رونے کے لئے

میر :-

سہے نہ تجھے میر بت کرڈھاکر   دل ہو نہ گیا گداز تیرا

راسخ :-

الفت سے ساز کر کہ اُس کو   آتا ہے دل گداز کرنا

میر صاحب فرماتے ہیں :-

ایک تجھے ہم وے نہ ہوتے ہست اگر   اپنا ہونا بیچ میں حائل ہوا

دوسرا شعر :-

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ   ہم نہ ہوئیں تو پھر حجاب کہاں

راسخ :-

پردہ ضرور کیا تھا جب سب تمہیں تھے صاحب
حیرت یہ ہے کہ ہم کو کیوں درمیاں بنایا

غالب :-

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

میر صاحب پھر فرماتے ہیں :-

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی ادھر سے آوے گا
یا نوشتہ ان ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاوے گا

دیکھیے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے
دل اپنا تو بجھا سا دیا ہے جان چراغ مضطر ہے

راسخ فرماتے ہیں۔

صبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھیے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے

میر صاحب فرماتے ہیں۔

احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا کچھ زیر لب کہا بھی سو دیر دیر رو کر

راسخ :-

تمہاری بات اب راسخ سمجھ میں کس طرح آئے
گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو

میر صاحب :-

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

راسخ مثنوی حسن و عشق میں فرماتے ہیں۔

جوگی بنا کام روپ آخر کھو بیٹھا وہ رنگ روپ آخر
دریا دریا رلایا اس کو صحرا صحرا پھرایا اس کو

میر صاحب :-

وے محو ناز ہی رہے آئے نہ اس طرف میں منتظر تو جاں سے گیا ان کا کیا گیا

راسخ مثنوی ناز و نیاز میں فرماتے ہیں۔

جی گیا میرا شوق کے مارے   سر گیا ناز کا تیرے بارے

میر صاحب مثنوی شعلۂ عشق میں فرماتے ہیں۔

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا   کہیں سینہ میں آہ سرد ہوا

راسخ۔

سینہ میں ہو کے دل دھڑک اٹھا   کہیں شعلہ ہوا بھڑک اٹھا

میر صاحب فرماتے ہیں۔

مر ہی جاویں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے
بھول تو ہم کو گئے ہو یہ تمھیں یاد رہے

راسخ مثنوی مکتوب شوق میں کہتے ہیں۔

بھولے تو ہم لیک یہ رہے یاد   جاتا رہا جی ہی گریہ ناشاد
تو یاد بہت کیا کرو گے   ہاتھ اپنے سدا ملا کرو گے

میر و غالب۔

میر صاحب فرماتے ہیں۔

[illegible] ہے تمام بحر دنیا   دیکھے گا کہ ہونٹ تر نہ ہوگا
نرا وہم کا ہی ہے دریائے ہستی   نہیں کچھ تہ سے تجھ کو آشنائی

جہاں کا دریائے بیکراں تو سراب پایان کار نکلا
جو لوگ تہ سے کچھ آشنا تھے انھوں نے لب تر کیا نہ اپنا

غالب :-

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی   ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

میر صاحب :-

حیف وے جن کے وہ اس وقت میں پہنچا جس وقت
اُن کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

غالب :-

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

میر صاحب :-

کچھ نہیں اور دیکھیں ہیں کیا کیا   خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی
جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں   عالم میں خوب دیکھو تو عالم ہے خواب کا

غالب :-

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

میر صاحب :-

آدمیت سے تمہیں میر ہو کیونکر بہرہ   تم نے صحبت نہیں رکھی کسو انساں کے ساتھ
ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے ملک   آدمی ہونا بہت مشکل ہے یاں

غالب :-

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا   آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

میر:-

کیا ہوا پہلو سے دل کیا جانوں یہ جانوں ہوں میں
ایک قطرہ خوں جھلکتا صبح چشم نم میں تھا

غالب:-

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

میر و ذوق:-

میر-

پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر

ذوق:-

یاں وہ نشے نہیں جنھیں ترشی اتار دے دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے

میر:-

یاس گئی ہو چکی تو پھر نہیں اشکال کچھ کام کو مشکل دلِ پُرآرزو نے کر دیا

ذوق:-

ناامیدی سے مگر آرام کی امید ہے بیقراری کا سبب ہر کام کی امید ہے

غالب:-

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

میر:-

میر کاٹا جیئے نہ کالوں کا دم نہ لے اس کی زلفوں کا مارا

ذوق :-

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کا اثر ہے کھیلے

دہان و گیسو کا تیرے مارا نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

میر :-

کچھ سمجھتے نہیں ہمارا حال   تم سے بھی اے بتاں خدا سمجھے

ذوق :-

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے

اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

میر :-

اک گھڑی صاف نہیں ہم سے ہوا یار کبھی

دل بھی جوں شیشۂ ساعت ہے مکدر اپنا

ذوق :-

رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونو   کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

میر :-

ناخن سے بوالہوس کا گلا یوں ہی چھل گیا   لوہو لگا کے وہ بھی شہیدوں میں مل گیا

ذوق :-

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا

یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

میر:-

جہاں میں نہ کی میر اقامت کی نیت   کہ مشعر تھا آنا مرا یاں سفر پر

ذوق:-

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے   زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

میر:-

اک نور گرم جلوہ فلک پر ہے ہر سحر   کوئی تو ماہ ہمارا ہے میر اس رواق میں

(؟)

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں   کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میر و وزیر:-

میر:-

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا یکبارگی

وزیر:-

دیدہ سمندر سے سوا ہوگیا   دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا

میر و مومن

میر:-

میرے تغیر رنگ پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

مومن :-
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ ۔ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

میر :-
بتوں کے جرم الفت پر مجھے زجر و ملامت ہے
مسلماں بھی خدا لگتی نہیں کہتے قیامت ہے

مومن :-
تمھیں تقصیر اس بت کی کہ ہے میری خطا لگتی
مسلمانو ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی

میر و داغ -

میر :-
ستم میں ہماری قسم ہے تمھیں ۔ کرو صرف جتنا کہ مقدور ہے

داغ :-
ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہِ الفت کبھی نہ کرنا
تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

میر :-
صد گونہ عاشقی میں ہم نے جفا سہی ہے ۔ پر یہ کہا نہ ظالم اس کی نہیں سہی ہے

داغ :-
جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی ۔ سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

میرؔ و شادؔ۔

میرؔ:۔

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے ۔ زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

شادؔ:۔

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا ۔ زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا

میرؔ:۔

اس شوخ نے سُنا نہیں نام صبا ہنوز ۔ غنچہ ہے وہ لگی نہیں اُس کو ہوا ہنوز

شادؔ:۔

..... ابھی ہے نام خدا و غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے

میرؔ و آتشؔ ۔

میرؔ:۔

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات ۔ پر ہم سے تو تھمی نہ کبھو منہ پر آئی بات

آتشؔ:۔

یہ صدا آتی ہے خموشی سے ۔ منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات

میرؔ و نسیمؔ ۔ (لکھنوی)

میرؔ:۔

از خویش رفتہ اُس بن رہتا ہے میرؔ اکثر ۔ کرتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

نسیمؔ:۔

کس سوچ میں ہو نسیم بولو ۔ آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

بقا کی خواہش اور یقین

کرینگے یاد باتیں تو کہینگے　　کہ کوئی رفتۂ بسیار گو تھا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز　　تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

گیا جہان سے [illegible] گرچہ میر　　ولیک مجلس دُنیا میں اُسکی جا ہے گرم

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ

مدّت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

یکم جون ۱۹۴۲ء

(ڈاکٹر) عظیم الدین احمد
(پی - ایچ - ڈی)
فیلو پٹنہ یونیورسٹی - صدر شعبہ عربی و فارسی و اُردو
پٹنہ کالج

پیش لفظ

انتخاب کلام میر پٹنہ یونیورسٹی میں لڑکوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ چند کتابیں میر کے متعلق داخل نصاب بھی ہیں مگر کوئی کتاب بھی طلبہ کلیہ کی تمام ضرورتوں کو اچھی طرح پوری نہیں کرتی۔ اس مختصر کتاب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ کلیہ کے طلبہ کو میر اور کلام میر کے متعلق اُن کی ضرورت کے موافق خاطر خواہ واقفیت ہو جائے اور وہ ممتحنوں کے ہر اہم اور مناسب سوال کا جواب مختصر الفاظ میں متعین وقت کے اندر لکھ سکیں۔ انتخاب اشعار میں بھی طلبہ ہی کی ضرورت اور ممتحنوں کے میلان طبیعت کا لحاظ کیا گیا ہے۔

چونکہ میں نے اس تالیف کو جناب مکرم پروفیسر ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب صدر شعبہ علوم عربی و فارسی و اردو پٹنہ یونیورسٹی کے تشویق و ترغیب سے لکھا ہے، اس لئے میری طرح اس کتاب سے فائدہ اٹھانے والے طلبہ بھی ہمیشہ اُن کے منت شناس رہیں گے۔ اس کتاب کو مفید اور دلچسپ بنانے میں جناب ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے جو کارآمد مشورے دئے ہیں میں اُن کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میرا فرض تشکر پورا نہ ہوگا اگر میں اُن ارباب قلم کا ذکر نہ کروں

جن کی مفید اور مستند کتابوں اور تحریروں سے مجھے اس مختصری کتاب کے لکھنے میں مناسب مدد ملی۔ جب میں یہ کتاب لکھ رہا تھا تو مندرجہ ذیل کتابیں میرے پیشِ نظر تھیں۔ میں مصنفین اور مؤلفین کتب متذکرہ ذیل کا منت پذیر ہوں +

گلشنِ ہند، گلِ رعنا، جلوۂ خضر، ترجمہ تاریخ ادب اردو، آبِ حیات، انتخاب کلام میر، میر کے نشتر، تذکرۂ شعرائے اردو، جریدہ ہمایوں۔ ۱۵ اپریل ۱۹۳۴ء جریدہ زمانہ ستمبر ۱۹۳۱ء تاریخ شعرائے بہار جلد اول۔

عبدالمنان بیدل

پٹنہ یکم اگست ۱۹۳۴ء

معرفی | میر کا نام آیا اور بے ساختگی، خستگی، سوز و گداز، غم و الم، قلبی واردات اور عاشقانہ جذبات کا صحیح تخیل اور سچا نمونہ پیش ہو گیا۔

ہمیں اس امر اور واقعہ صحیح سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ہماری شاعری دنیا کی اور متمدن اور ترقی یافتہ قوموں کی شاعری کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جا سکتی، اس کی توجیہ بہت کچھ کی جا سکتی ہے مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس سے کوئی منصف مزاج ادیب اور وسیع النظر متکلم انکار نہیں کر سکتا۔ تاہم جس طرح انگریز چاسر اور اسپنسر کی تصانیف کا مطالعہ اب بھی ذوق و شوق سے کرتے ہیں اور فیری کوئین کو پڑھ پڑھ کر مزے لیتے ہیں ہم بھی میر اور کلام میر کو بھول نہیں سکتے اور ہمیں بھی میر کے اشعار میں باوجود اس امر کے کہ اس کی زبان زیادہ تر پرانی ہے اس وقت بھی ایک عجیب روح افزا کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

ناخدائے سفینہ سخن میر محمد تقی میر غالباً ۱۱۳۷ھ میں شہر اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام خود بقول میر (بخلاف آب حیات اور گلزار ابراہیمی) میر علی متقی تھا۔ یہ اکبرآباد کے ان مقتدر اور معزز لوگوں میں سے تھے جن کا احترام ہر صغیر و کبیر کرتا تھا۔ ان کی فطری خاکساری

اور ملنساری نے انھیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ یہ بڑے عابد و زاہد تھے اور لوگ انھیں اسی وجہ سے "علی متقی" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔

میر صاحب کا خاندان گردشِ آسمان سے تنگ آکر حجاز سے چل کر دکن پہنچا۔ وہاں سے احمد آباد اور گجرات آیا۔ اکثر اراکینِ خاندان تو وہیں رہ گئے مگر میر کے پردادا اکبر آباد چلے گئے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی۔ میر کے دادا آگرہ میں محکمۂ فوجداری میں کسی عہدہ پر ممتاز تھے۔

میر صاحب کا خاندان شریف اور تعلیم یافتہ تھا۔ میر صاحب مذہبًا شیعہ اور ذات کے سید تھے، فرماتے ہیں ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اپنی سیادت و شرافت کا اشارہ میر نے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ اس شعر سے ان کے مذہبی غلو کا پتہ چلتا ہے ؎

جو حیدری نہیں اسے ایمان ہی نہیں   ہو گو شریف مکہ مسلمان ہی نہیں

میر کے والد نے غالبًا دو شادیاں کی تھیں، میر صاحب دوسری بیوی سے تھے۔ پہلی بیوی سے جو خان آرزو کی ہمشیرہ تھیں، ان کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن تھے۔ میر صاحب کے چھوٹے بھائی کا نام محمد رضی تھا۔ میر صاحب کی ایک بہن بھی تھیں جو دلی میں میر محمد حسین کلیم سے بیاہی گئی تھیں، آپ نغز گو شاعر اور عالم نکتہ فہم تھے اور میر صاحب سے محبت

رکھتے تھے۔ میر صاحب کے لڑکے کا نام فیض علی تھا اور میر صاحب کے بھتیجے کا نام محسن تھا۔ یہ بھی مشہور شاعر تھے۔ ان کا یہ شعر اپنے خاص رنگ کا ہے ؎

بتخانہ کی شکست و درستی کعبہ ہائے
یہ سب کیا پہ شیخ نے دل میں نہ گھر کیا

میر تقی میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا۔ ان کا مزار بیش باغ لکھنؤ میں عرصہ دراز تک زیارت گاہِ خلائق رہا۔

سراپا اور وضع میر صاحب میانہ قد اور لاغر اندام تھے۔ چہرہ کا رنگ گندمی تھا۔ آواز میں نرمی اور ملائمت تھی۔ چال میں سستی اور سنجیدگی تھی۔ گفتگو رک رک کر کیا کرتے تھے۔ چہرے سے تفکر و تدبر کے آثار نمایاں تھے۔ کھڑکی دار پگڑی۔ پچاس گز کے گھیر کا جامہ۔ کمر بند کی جگہ چوڑا رومال۔ اس میں سیدھی تلوار۔ نوکدار جوتا۔ مشروع کا پاجامہ اور ہاتھ میں جریب آپ کی وضع تھی، اور قریب قریب یہی لباس اس زمانہ کے اکثر شرفا اور رئیسوں کا تھا۔

کیریکٹر میر تقی میر نہایت مہذب۔ متین۔ صاف دل۔ زندہ دل۔ یار باش اور وضع دار تھے۔ جس آدمی کے ساتھ جس طرح کا برتاؤ شروع کیا اس کو تا عمر نباہنے کی سچی کوشش کی۔ "میر صاحب کے احباب کا دائرہ، بقول حسرت شروانی "بہت وسیع تھا اور اس زمانہ میں دوستی اور محبت محض خالی الفاظ نہ تھے بلکہ ان الفاظ کے کچھ معنی تھے

اور معنی کے ساتھ برتاؤ اور اخلاص کے لوازم" ان کا اخلاق وسیع تھا اور ان کے سینہ میں ایک دردمند دل تھا۔ کلام میں متانت اور سنجیدگی تھی۔ کم سخن اور بذلہ سنج تھے۔ غیرت مند اور خود دار، آزردہ دل اور نازک مزاج تھے۔ فرماتے ہیں ؎

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ

نکات الشعرا مؤلفہ میر تقی میرؔ سے ان کی سیرت اور خلق و عادت کا پتہ چلتا ہے۔ جس انداز سے میرؔ نے شعرا کا تذکرہ کیا ہے اس سے ان کی صاف دلی اور غیر جانب داری کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ جس شاعر کا کیریکٹر اور کلام پسند آیا اس کی مناسب تعریف کی ہے اور جس شاعر کے کلام اور انداز میں کوئی نقص اور عیب دیکھا اس کو بھی صاف صاف لکھ دیا ہے۔ خواجہ میر ناصر صاحب عندلیب کو "مقتدائے عالم" اور خواجہ میر دردؔ کو "قبلۂ اہل عرفان" اور مرزا مظہرؔ کو "بے نظیر اور خوش تقریر" اور مرزا سوداؔ کو "گرمجوش اور یار باش" اور کرم اللہ خاں کو "خوش فکر اور عاشق سخن" لکھا ہے۔ اور شیخ حاتمؔ کو "جاہل اور دیر آشنا" اور انعام اللہ خاں یقینؔ کو "پوچ گو اور شیطان خو" اور میاں احسن اللہ [illegible] کو "[illegible]" اور دیگروں کو "ہیچمدانِ فن ریختہ" اور محمد یار خاکسار کو "سفلہ" اور ان کے اشعار کو "نامربوط اور نادرست" لکھا ہے۔ [illegible] تاریخ نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ حقائق کو بے نقاب کر دے۔

اور میر نے بھی کیا ہے اور اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اظہارِ رائے میں اخلاقی جرأت رکھتے تھے اور کوئی لاگ سے نہیں ڈرتے تھے۔ آلام اور افکار کے تسلسل نے میر کو شکستہ دل میر کو ذکی الحس اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ بھائی کی کج خلقی اور اعزا کی غیر متوقع سرد مہری نے میر کی طبعِ نازک پر بڑا اثر ڈالا تھا۔

قدرت نے ان کو انتہا درجہ کی نزاکت اور احساس طبیعت تفویض کی تھی۔ ان کی نازک مزاجی کا یہ حال تھا کہ راجہ ناگرمل جیسے محسن اور سرپرست کی رفاقت محض اس واسطے چھوڑ دی کہ جو ایسا ہو وہ اس کے لکا پر بادشاہی امرا سے کر آئے تھے اس پر اس نے عمل نہیں کیا اقبال جیسا خوددار ہوتا

ع - بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر سر میں ہے خودی کا

میر میں بھی خودی اور ایک "احساسِ شخصیت تھا" رعایت خاں کی ملازمت جس کی وجہ سے ان کی صورتِ اوقات بسری نکل آئی تھی محض اسی وجہ سے چھوڑ دی کہ اس نے ایک روز ان سے درخواست کی کہ آپ اپنی کوئی اچھی سی غزل میرے گویے کو گانے کے لئے دے دیجئے۔

اپنی قابلیت اور علمیت پر نازاں تھے۔ دوسروں کو اپنے مقابل نہیں سمجھتے تھے ان کی مشہور مثنوی اجگر نامہ اس کا ثبوت ہے جس میں انھوں نے اپنے کو اژدہا اور دوسرے شاعروں کو چھوٹے چھوٹے جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ اپنے معاصر شاہ حاتم کی خوب خوب ہجو کی ہے۔ اپنے کمال

کا اظہار میر صاحب نے دوسرے شاعروں سے کہیں زیادہ اپنے اکثر اشعا
ر میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہیئے اہل سخن میر کو استاد کریں

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے　　معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

جہاں سے دیکھئے اِک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا　　مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اس آخری شعر میں تعلّی کی حد ہو گئی۔ کوئی شاعر فرمانے کا لفظ اپنے لئے استعمال نہیں کر سکتا ہے۔

میر صاحب حسن پرست اور عاشق مزاج بھی تھے۔ ان کے دیوان میں اکثر ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے اس دعوے کا ثبوت ملتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کچھ رنج دلی میر جوانی میں کھنچا تھا　　زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

دوسری جگہ اپنی غزل گوئی کے شوق کی توجیہ کرتے ہیں ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا　　وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

تعلیم و تربیت ایک بزرگ سید امان اللہ بیانہ کے باشندہ تھے۔ میر کے والد بزرگوار سے خاص ارادت رکھتے تھے۔ جوشِ عقیدت میں ترک وطن کیا، آگرہ آئے اور یہیں رہ گئے۔ میر صاحب کی تربیت میں انھوں نے خاص حصہ لیا۔ میر صاحب بھی اُن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ہمیشہ "عم بزرگوار" کہہ کر یاد کرتے۔ سراج الدین خاں کو اپنا استاد اور پیر و مرشد لکھا ہے۔ ایک عالم ساکن عظیم آباد میر جعفر نامی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ خواجہ میر درد کے فیوض سے بھی اکتساب کیا تھا۔ میر سعادت علی ساکن امروہہ نے ان کو شوق دلایا کہ ریختہ میں شعر موزوں کریں۔ خواجہ ناصر عندلیب والد خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں اکثر بغرض استفادہ حاضر ہوا کرتے۔ انھوں نے جب اِن کی ذہین طبیعت، حساس دل اور فطری سوز کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ ان کا حوصلہ بڑھایا اور پیشین گوئی کی کہ "میر تقی تم میر مجلس ہوگے"۔

میر صاحب کی تحصیل علمی کا تفصیلی حال پوری طرح معلوم نہیں مگر ان کی تصنیفات سے مستنبط ہوتا ہے کہ فارسی کی استعداد بھی اچھی تھی۔ میر نے کوئی صنف شاعری ایسی نہیں جس میں طبع آزمائی نہ کی ہو، اور واسوخت کے موجد تو اُردو میں بقول آزاد میر ہی ہوئے۔

تصانیف میر اُردو غزلیات کے متعدد دیوان؛
ایک دیوان فارسی۔

مثنویاں: اژدرنامہ۔ شعلۂ عشق۔ جوشِ عشق۔ دریائے عشق۔ اعجازِ عشق
معاملاتِ عشق۔ خواب و خیال۔ شکارنامہ۔ مثنوی مرغ بازاں
ساقی نامہ۔ مرثیہ۔

فیضِ میر:۔ فارسی زبان میں ایک رسالہ ہے جس کے آخر میں چند
قصے اور لطیفے ہیں۔

نکات الشعراء:۔ فارسی زبان میں شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔

ذکرِ میر:۔ فارسی زبان میں میر صاحب کی خود نوشتہ سوانح عمری۔

جستجوئے معاش میں میر کی شہر گردی

زوال و فنا کا زبردست قانون بڑی سے بڑی طاقت سے بدلا نہیں جا سکتا۔ وہ خفلت شعار انسان جو ایک قلیل وقفہ کے لئے مالکِ تخت و تاج یا صاحبِ سلطنت و سطوت ہو جاتا ہے اپنی نادانی سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی تمام ملکیتیں دائمی اور ابدی ہیں۔ دُنیا دیکھتی ہے کہ سلطنتیں مٹ جاتی ہیں، ملک تباہ ہو جاتے ہیں، شہر کھنڈر بن جاتے ہیں۔ فاتح مفتوح ہو جاتا ہے جسم لاغر ہو جاتا ہے۔ حُسن کا جادو بے اثر ہو جاتا ہے مگر پھر بھی سبق نہیں لیتی مسلمانوں کی سلطنت ایسی زبردست سلطنت تھی کہ اس کی مثال اوراقِ تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ جس شان سے مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی وہ دُنیا کے لئے سامانِ رشک تھی مگر اس کو بھی قانونِ زوال و فنا کے ماتحت مٹنا تھا اور مٹ کے رہی۔ کسی انسان کی موت اس قدر تکلیف دہ

نہیں ہوتی جتنی اُس کی نزع کی حالت روح فرسا ہوتی ہے۔ میر اور
برگشتہ بخت میر کو سلطنت مغلیہ کو حالت نزع میں دیکھنا پڑا۔ اور یہی
وہ نظارۂ جانکاہ تھا جس نے میر کو میر بنا دیا، اور اس کا شیشۂ دل ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے چکنا چور ہو گیا۔ دلّی برباد ہو رہی تھی۔ سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا
رہا تھا۔ مرہٹوں کا زور تھا اور جاٹوں کا ہنگامہ۔ مزید براں خانہ جنگیاں۔
ملک تباہ ہو رہا تھا۔ جان و مال کی خیر نہ تھی۔ کوئی دل مطمئن نہ تھا۔ شرفاء
تباہ حال اور پریشان روزگار تھے۔ کسب معاش کی کوئی مناسب و معقول
شکل نظر نہ آتی تھی۔ صاحبان علم و فضل کس مپرسی کی حالت میں ٹھوکریں
کھاتے پھرتے تھے۔ مفلسی اور تنگ حالی کی ہمت شکن مصیبت سے
بچنے کے لئے بہت سے علما اور شعرا لکھنؤ اور فرخ آباد کی طرف جا رہے
تھے۔ میر بھی جو حصول معاش کے لئے دلّی آئے تھے۔ یہ حال دیکھ کر
لکھنؤ پہنچے۔ یہ نواب آصف الدولہ (ولد نواب شجاع الدولہ) کا زمانہ تھا۔
میر نواب کے ملازموں میں داخل ہو گئے۔ مگر بدقسمتی سے جب نواب صاحب
نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے تو میر صاحب کی ملازمت جاتی رہی۔
کوئی صورت معاش نہ تھی۔ میر پھر آگرہ چلے آئے اور جب تنگ دستی نے
یہاں پھر ستایا تو پھر دلّی کا رخ کیا۔ دلّی میں کچھ دنوں اپنے سوتیلے ماموں
سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں رہے۔ جب تھوڑے دنوں کے
بعد ان کے ماموں کا سلوک اچھا نہ رہا تو اُن کا مکان چھوڑ دیا اور ایک

رئیس رعایت خاں نامی کے مصاحبوں میں داخل ہوگئے۔ کچھ دنوں کے بعد ناموافقت طبیعت کی وجہ سے رعایت خاں کی بھی ملازمت سے دست بردار ہوگئے۔ اس ترک ملازمت کے بعد مہانرائن دیوان کی سرکار سے متوسل ہوگئے۔ راجہ جگل کشور سے ملاقات ہوگئی اور اُن کے ذریعہ سے مہاراجہ ناگرمل سے ملے۔ اُن کے بیٹے نے اُن کی کچھ تنخواہ مقرر کردی۔ مگر تھوڑے دنوں کے بعد ملازمت چھوڑ دی۔ انسان اپنی تمام خواہشات پر قابو پاسکتا ہے۔ اکثر مجبوریوں پر صبر کرسکتا ہے۔ بے خانماں اور بے لباس رہ سکتا ہے مگر اس "شکم پیچ پیچ" پر قابو پانا مشکل ہے۔ بھوک کی تکلیف برداشت کرنی محال ہے۔ فقر و فاقہ نے کتنے انسانوں کی خود داری و تمکنت اور بے نیازی و تکبر کو خاک میں ملا دیا۔ میر بھی خود دار تھے۔ بے نیاز طبیعت اور لاپروا مزاج رکھتے تھے مگر فقر و فاقہ کی تاب نہ لاسکے اور پھر تلاش معاش میں نکلے۔ وجیہ الدین خاں برادر حسام الدولہ سے ملے اور اس نے کچھ مشاہرہ مقرر کردیا۔ حسن رضا خاں اور عالمگیر ثانی اور ابوالقاسم خاں بھی میر صاحب کے ساتھ اکثر مالی سلوک کیا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ غیور اور خود دار میر کو بھی ارباب کرم کے دست احسان کا رہین منت رہنا ہی پڑا۔

میر صاحب کے عہد کی معاشرت

میر کا زمانہ وہ پُر آشوب اور قیامت خیز زمانہ تھا جب کہ سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

ہر طرف ہنگامہ ہی ہنگامہ تھا۔ بدامنی اور بے چینی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی بادشاہ کمزور اور اُمرا پریشان حال تھے باوجود اس کے اس عہد میں باکمال شعرا پیدا ہوئے۔ اگرچہ کوئی متنفس حقیقی معنوں میں آسودہ حال اور شادکام نہ تھا مگر پھر بھی اس عہد کے شرفا میں علم پروری اور ہنر دوستی کا ذوق نمایاں طور سے پایا جاتا ہے۔ جابجا مدرسے تھے اور ادبی مجلسیں قائم تھیں۔ مناظرے اور مشاعرے کا ہر جگہ رواج تھا اور تحصیلِ علم کا مقصود تحصیلِ دولت نہ تھا۔

فن ادب کی خدمت صرف شعرا اور اُمرا ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس مستحسن کام میں بزرگانِ دین اور تجار وغیرہ بھی کافی حصہ لیتے تھے۔

اُس عہد میں شعر گوئی کو فعل عبث نہیں سمجھتے تھے اور شعرا کا طبقہ ایک بیکار فرقہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جو صرف عالمِ خیال میں رہتا ہو بلکہ اُس زمانہ میں اکثر تجار۔ زمیندار۔ اہل حرفہ اور اطبا شاعری کو خدمتِ ادب تصور کرتے اور سرمایۂ سرور معصوم۔

ہندو مسلمانوں کے تعلقات اُس زمانہ میں ایسے تھے جیسے اپنے بھائیوں میں ہوتے ہیں۔ جس طرح بھائیوں میں لڑائی ہوتی ہے وہ آپس میں لڑتے بھی تھے مگر پھر مل بھی جاتے تھے۔ لڑائی جھگڑائی میں مذہب و ملت کا امتیاز نہیں ہوتا تھا۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کا نام اُس وقت کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ہندی اُردو کا بے بنیاد جھگڑا جس میں زمانۂ حال کے ہندو اور مسلمان دونوں

گرفتار ہیں آج کل کا فتنہ ہے۔ میر کے زمانے میں اس زبان کو جسے آجکل لوگ اُردو کہتے ہیں چاہے اُردو سمجھو یا ہندی۔ ریختہ کہو یا ہندوستانی۔ ہندو اور مسلمان اہل ادب اور ہوا خواہان وطن اپنی سعیٔ مشترکہ کا ثمرہ سمجھتے تھے۔ ابتدائے تاریخ اُردو سے لے کر آج تک یہ اشتراکِ عمل ثابت ہے۔ مسلمانوں کے لکھے ہوئے تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فن ادب اُردو کی خدمت میں جتنا حصّہ مسلمانوں کا ہے اس سے ہمارے ہندو بھائیوں کا حصہ کم نہیں ہے۔ میر کے زمانے میں ہندوؤں میں بڑے بڑے فارسی اور اُردو کے شعرا تھے۔ کسی عالی خاندان لڑکے کی تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک وہ اُردو زبان میں بھی کافی دستگاہ نہ رکھتا ہو۔

غم ہو یا شادی، عید ہو یا ہولی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس زمانہ میں یہ وضعداری تھی کہ ہندو مسلمان ہر جگہ ہر موقع پر محبت اور خلوص کے ساتھ مل رہے ہیں۔ لڑائی جھگڑا۔ مقدمہ۔ غدّاری۔ بیوفائی اور بداخلاقی کے عیوب اُس زمانہ میں بھی تھے مگر ہندو اور مسلمانوں میں وہ عیب نہ تھا جس کا نام تعصب ہے اور جو تمام عیوب سے زیادہ بُرا اور حیات ملّی کے لئے سب سے زیادہ مُہلک ہے۔

ہندوؤں کو مسلمانوں پر اعتبار تھا اور ہر مسلمان اپنے ہندو بھائی کا مددگار تھا۔ ہندوؤں کے یہاں بکثرت مسلمان ملازمین تھے اور قریب قریب تمام مسلمان امرا کے یہاں جلیل القدر عہدوں پر ہندو ممتاز تھے۔ مصیبت

کے وقت مسلمان ہندوؤں کی مدد کرتے تھے اور ہندو مسلمانوں کے حامی تھے۔ میر کے زمانے کے تمام سچے تذکرے اور قابل وثوق تاریخیں متذکرہ بالا بیانات کی تصدیق کرتی ہیں۔

خصوصیات عصر میر شاہ عالم کا زمانہ آنا تھا کہ محمد شاہی دور کے شعرا کی روش عام پسند نہ رہی۔ یہ زمانہ اردو شاعری کا صحیح معنی میں "دور ترمیم و ترقی" ہے۔ مرزا مظہر جانجاناں۔ خواجہ میر درد۔ مرزا سودا اور میر تقی میر جیسے اساتذۂ فن اور مصلحین زبان پیدا ہوئے۔ میر سے پہلے شاعری نے کوئی باوقار اور سنجیدہ شکل اختیار نہیں کی تھی بلکہ اردو شاعری نہایت مبتذل اور سوقیانہ تھی۔ مگر شعرائے عصر میر نے اس محبوبۂ شاعری کو آراستہ و پیراستہ کر کے سخن سنجوں کے دربار میں پہنچا دیا۔ سودا فرماتے ہیں ؎

کہے تھا ریختہ کہنے کو عیب ناداں بھی
سو یوں کہا میں، کہ دانا ہنر لگا کہنے

میر صاحب کہتے ہیں ؎

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

(۱) محمد شاہی دور میں ایہام گوئی کا بڑا شوق تھا اس دور کے اساتذہ نے اس عیب سے اپنے کلام کو بہت کچھ پاک کیا۔ چنانچہ سودا کہتے ہیں ؎

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

(۲) میر کے پہلے شعرا عربی اور فارسی الفاظ کی بہ نسبت بھاشا اور دکنی الفاظ زیادہ استعمال کرتے تھے لیکن شعرائے عصر میر نے عربی اور فارسی الفاظ اور محاورے بجنسہٖ یا بصورت ترجمہ زبان میں داخل کر دئیے۔ اور زبان کو بہت کچھ پرانی اور کرخت بندشوں سے پاک کیا۔

(۳) میر و مرزا نے بہت سے قدیم ہندی محاورات اور الفاظ میں تغیر و تبدل کر دیا۔

(۴) اس دور کے شعرا نے فارسی شعرا کے کلام کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی اور اسی تقلید و تتبع کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلام میں فارسی ترکیبیں اور ترجمے بھر گئے اور اردو شاعری نے فارسی کا قالب اختیار کر لیا۔

(۵) اس دور میں غزلوں کی وہ بحریں مستعمل ہونے لگیں جن کا بہت زیادہ رواج پہلے نہ تھا۔

(۶) مربع۔ مخمس۔ مستزاد۔ مرثیہ۔ واسوخت وغیرہ اصناف شعر کا رواج بہت بڑھ گیا۔

اس عہد میں زبان اردو نے کافی ترقی کی اور اس میں وہ جوہر اور قوت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے آج تک ترقی کرتی جا رہی ہے۔

کلام میر پر ایک طائرانہ نگاہ

"میر کو خدائے سخن کہتے ہیں" کیوں؟ یہی امر دریافت طلب ہے کہ میر کے کلام میں کونسی ایسی خاص

خصوصیت ہے جس کی بنا پر سخن سنجوں نے اُسے یہ خطاب دیا ہے۔

کلامِ میر کے متعلق علّامہ جناب ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب فرماتے ہیں کہ "جذبات کی مصوری، شاعری کی جان تو ضرور ہے مگر اس کا ایسا نقشہ الفاظ میں کھینچنا کہ دوسرے بھی اس موہنی صورت کو اس کی اصلی صورت میں دیکھ لیں اور پھر نہ بھولیں، یہ ایک قطرۂ امتیاز ہے کہ ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتا۔ مگر جس کو یہ دولت میسر ہوگئی وہ صرف مصوری نہیں بلکہ غیر فانی مصور ہو جاتا ہے۔ میر کو یہ دولت مل گئی، اور اب وہ صفحۂ عالم سے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔"

میر اس لئے شعر نہیں کہتا تھا کہ اُسے ذوق کی طرح بادشاہِ وقت کو خوش کرنا تھا یا غالب کی طرح مضمون کی "ہوا باندھنے" کا شوق تھا یا ناسخ کی طرح اُسے رعایتِ لفظی کی بہار دکھانی تھی یا انشا کی طرح "روزمرہ" کو کسی مصرع میں کھپانے کا ذوق تھا، یا وزیر کی طرح مشاعروں کی "واہ واہ" کی تمنا تھی، بلکہ میر جس کا دل تیرِ محبت کا گھائل تھا اور جو ستم ہائے فلک کا تختۂ مشق تھا اکثر سوزِ دروں سے تنگ آکر اور وارداتِ قلب سے مجبور ہو کر جذبات کی مصوری کرنے کے لئے شعر کہا کرتا۔

کسی شاعر کے کلام پر تنقید و تبصرہ کرنا اُس کے خاص اندازِ بیان کو نمایاں کرنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے کردار کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ میر کے کلام میں سوز و گداز ہے اور اس کا شعر کسی دل کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا تو ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ میر رقیق القلب

تھے اور اسی وجہ سے اِن کے اکثر اشعار لوگوں کے دلوں میں رقت پیدا کرتے ہیں اور اکثر آنکھیں میر کے اشعار پڑھ کر اشکبار ہو جاتی ہیں۔

خدائے سخن میر نے تمام اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی گو اُن کی خاص اور محبوب عام چیز غزل ہے قصیدہ، رباعی، مثنوی، مرثیہ، واسوخت سبھی کچھ لکھا، قصیدہ اُن کی اُفتادِ طبیعت کے خلاف تھا۔ مرثیہ انھوں نے "محض بغرض ثواب" لکھا اور اسی لیے اُن میں مرثیہ گویوں کی خوش اسلوبی نہیں اور بقول سودا "میر کے مرثیے شاعرانہ حیثیت سے بہت پست ہیں۔"

علامہ آزاد فرماتے ہیں کہ "اُردو میں واسوخت کے موجد میر ہی ہوئے، مگر میر مہرِ منیر ہو کر چمکے تو غزل میں میر کا دیوان گلہائے تر کا ایک ایسا گلدستہ لاجواب ہے جس کی خوشبو قیامِ قیامت تک مشامِ جان کو معطر کرتی رہے گی۔ میر کے اشعار میں پیامِ حیات ہے، میر کی غزلوں میں فلسفۂ عشق ہے، میر کے کلام میں فن غزل گوئی کی تکمیل ہے، میر نے حیات کی کارفرمائی کے بیان کا پیرایہ ایسا اختیار کیا ہے کہ اُس کے آگے اب کوئی نہیں بڑھ سکتا، وسیع مضامین کو مختصر الفاظ میں اس لطیف انداز سے ادا کیا ہے کہ خواجہ حافظ کے کلام کی چاشنی اُن کے اشعار میں ملنے لگتی ہے" میر کے کلام میں اُن کی زندگی اور اُن کے زمانہ کے آثار و علامات کثرت سے ملتے ہیں۔ میر کے کلام سے اُن کی شخصیت کا حال بآسانی معلوم ہو سکتا ہے اور بجا مشہور ہے کہ میر نے "پر بیتی بھی کہی اور آپ بیتی بھی"۔

میر کی مثنویاں بھی اچھی ہیں۔ میر کی پُرسوز اور آتش بداماں طبیعت کے متعلق لکھنا تحصیل حاصل ہے، زبان کی صفائی اور سلاست، جوشِ بیان اور صداقتِ جذبات نے میر کی مثنوی کو بھی قابلِ امتیاز بنا دیا ہے۔

میر نے بہت سی مثنویاں لکھی ہیں، شعلۂ عشق، دریائے عشق، جوشِ عشق، معاملاتِ عشق، اعجازِ عشق وغیرہ وغیرہ مگر ان تمام مثنویوں میں صرف دو مثنویاں یعنی شعلۂ عشق اور دریائے عشق بہت زیادہ قابلِ تعریف ہیں، میر کی مثنویاں گو اُن کی غزل سے بہت زیادہ کم پایہ نہیں مگر خبر نہیں کیوں بہت زیادہ معروف و مرغوب نہیں، میر کی اکثر مثنویاں حزنیہ ہیں، ہونی چاہئیں، میر کی زندگی کا بڑا حصہ ایک افسانۂ غم ہے۔

میر کی مثنویوں سے اُن کے فلسفۂ زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ میر کی حیاتِ ناکام کا جلوہ اُن کی غزلوں سے زیادہ نمایاں ہے۔ میر کی ہر ایک عشقیہ مثنوی میں اُس قسم کے اشعار ہیں جن سے تمام قصّہ کا خلاصہ پڑھنے والے کی سمجھ میں آجاتا ہے۔

میر کی مثنویوں میں جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے کوئی مافوق العادت عنصر کارفرما نہیں۔

میر کی مثنویوں میں بڑی دل پسند بات یہ ہے کہ اُن کے اکثر واقعات بہت زیادہ انسانی فطرت کے موافق ہیں۔

میر کی مثنویوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس حقیقت نگار شاعر

کو کردار نویسی میں بھی کمال تھا ؎

ایک جا اک جوان رعنا تھا — لالہ رخسار و سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اس کو صورت خوش سے — انس رکھتا تھا وضع دلکش سے
تھا طرح دار آپ بھی لیکن — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
سر میں تھا شور شوق دل میں تھا — عشق ہی اس کے آب و گل میں تھا

حقیقت نگاری اور مصوری لوازمات مثنوی نویسی ہیں، میر کی مثنویاں دیکھئے، صرف مادی اشیا ہی کا نقشہ نہیں کھینچا ہے بلکہ جذبات کی بھی مصوری کی ہے۔ محبت کی تصویر میر یوں پیش کرتے ہیں ؎

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا

لکھ چکا ہوں کہ میر کی مثنویاں زیادہ تر حزنیہ ہیں۔ اور حزنیہ تمثیل میں ضروری ہے کہ طرز ادا متین اور سنجیدہ ہو اور بیان پُر جوش و پُر درد ہو، یہ باتیں میر کی مثنویوں میں بدرجۂ کمال موجود ہیں، سادگی اور صفائی بیان جیسی میر کی غزلوں میں ہے تقریب قریب ویسی ہی میر کی مثنویوں میں بھی ہے۔
گوشہ نشین میر کو منظر نگاری کا شوق نظر نہیں آتا۔ غالباً میر کو مناظر قدرت کے مطالعہ کا موقع نہ ملا، منظر نگاری کا لطف اگر کسی مثنوی

میں دیکھنا ۔ میر حسن کی مثنوی سحرالبیان دیکھئے۔

میر کا دیوان جہاں محاسن کلام کی مثال اور کمال شاعری کی نظیر پیش کرتا ہے وہاں اکثر عیوب شاعری کے بدنما داغ بھی رکھتا ہے۔ اکثر جگہ فحش اور مبتذل اشعار پائے جاتے ہیں۔ غیر فطری اشعار سے اکثر غزلیں بھی بھری پڑی ہیں کلیات میر چونکہ رطب و یابس کا مجموعہ ہے اس لئے اس میں استادانہ ہمواری بھی نہیں۔

رموز تخلیق انسان کے غائر مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ فطرت نے انسان کے دل کو کمزور مگر لچکدار بنایا ہے، وہ بارِ غم سے جھک جاتا ہے مگر خوشی کے لمحے اسے بالیدہ کر دیتے ہیں، وہ مسلسل ایک حالت میں طویل مدت تک رہ نہیں سکتا، بدنصیب سے بدنصیب اور ناکام سے ناکام انسان کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی حیاتِ نامراد میں بھی چشمۂ تاباں کی طرح مختصر ہی سہی مگر خوشی کے لمحے بھی ہیں، چونکہ غم و الم کا اثر دیرپا ہوتا ہے اور شادمانی کا اثر بہت جلد مٹ جاتا ہے، اس لئے وہ انسان جو مصیبت زدہ ہے کہا کرتا ہے کہ "میری عمر تو روتے ہی کٹی اور تبسم کا نام ہی میں نہیں جانتا" اس کی وجہ صرف اس کی قوتِ حافظہ کی کمزوری ہے اور نعم منعم حقیقی کی ناسپاسی۔

میر اور مصیبت زدہ میر کے کلام میں حزن و الم، غم و رنج، حرمان و حسرت کی بہت مثالیں ہیں لیکن ان کے کلام میں شوخی و ظرافت اور

فلسفۂ خیام کی بھی مثالیں ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی اوائل زندگی میں مسرت کے لمحے بھی گذرے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

خوش رہا جب تلک رہا جیتا — میر معلوم ہے قلندر تھا

؎ تھے بُرے مغبچوں کے تیور لیک — شیخ میخانے سے بھلا کھسکا

؎ ہم تو گمراہ جوانی کے مزوں پر ہیں میر — حضرت خضر کو ارزانی ہو پیری کا مزا

؎ پھوٹا کسے کے پیالے نہ اٹھتا پھر اقرابہ — مستی میں میری تھا یاں اک شور اور شرابا

؎ نہ بہکے میکدے میں آہ میر کیونکر — گرو ہو جائے پیراہن ہمارا

؎ کچھ کم نہیں ہیں شعبدہ بازوں سے میگسار — دارو پلا کے شیخ کو آدم سے خر کیا

؎ خوبرو اب نہیں ہیں گندم گوں — میر ہندوستاں میں کال پڑا

؎ معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر — مسجد میں ہے کیا شیخ پیالہ نہ نوالا

؎ ستم ہیں قہر ہیں لونڈے شراب خانے کے — اُتار لیتے ہیں عمامہ ہر نمازی کا

؎ صرف اللہ خم کے خم کرتے — نہ کیا چرخ نے کلال ہمیں

؎ رہا پھولوں میں کرتا زمزمہ میں — مری اس باغ میں گذری صدا خوش

؎ جو ہوشیار ہو سو آج ہو شراب زدہ — زمین میکدہ یکدست ہے گی آب زدہ

؎ یوں بیٹھے بیٹھے ناگہ گردن لگے ہلانے — سر شیخ جی کے گویا مجلس میں پیر آئے

؎ وہ کالا چور ہے خالِ رُخِ یار — کہ سو آنکھوں میں دل ہو تو چرا لے

؎ ظالم کہیں تو مل کبھو دارو پیے ہوئے — پھرتے ہیں ہم بھی ہاتھ میں سر کو لیے ہوئے

؎ اپنا شیوہ نہیں کجی یوں تو — یار جی ٹیڑھے بانکے ہم بھی ہیں

شیخ جی آؤ مصلّے گرد جام کرو
جنس تقویٰ کے تئیں صرفِ مئے و جام کرو

فرش مستاں کرو سجادۂ بے تہ کے تئیں
مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو

دامنِ پاک کو آلودہ رکھو بادہ سے
آپ کو مغبچوں کے قابلِ دشنام کرو

ننگ و ناموس سے اب گذرو جوانوں کی طرح
پرفشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو

اُٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردنِ مینائے شراب
خدمتِ بادہ گساراں ہی سر انجام کرو

مطرب اگر جو کرے چنگ نوازی تو تم
پیرہن مستوں کی تقلید سے انعام کرو

سایۂ گُل میں لبِ جو پہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام کو او آپ کو بدنام کرو

رندی اور خباثت کی مثال اس سے بہتر کیا مل سکتی ہے کیا ان اشعار سے یہ دعویٰ باطل نہیں ہوتا کہ میر ایک ایسا شخص تھا جس میں نقوشِ مسرت اور خطوطِ شادمانی کی دھندلی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔

معتقدینِ میر

نفسیاتِ انسانی کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ تمام دنیا کسی ایک فرد کو کسی خاص حیثیت سے بھی بزرگ ترین اور اعلیٰ ترین نہیں مانتی۔ یورپ کے حکمائے نفسیات نے اکثر اس طرح کا سوال دنیا کے سامنے پیش کیا ہے کہ "سب سے بڑا فلسفی دنیا کا کون تھا" یا "سب سے بڑا شاعر دنیا میں کون ہوا ہے" یا "بہترین گویا دنیا میں کس کو کہہ سکتے ہیں" مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ بہ اتفاق آرا دنیا نے کسی کے سر پہ بھی تاجِ بزرگی نہیں رکھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض مشاہیر کو اکثر اساتذۂ فن کسی خاص حیثیت

سے بے نظیر اور لاثانی مانتے ہیں۔ ہندوستان کا ممتاز شاعر میر بھی انہیں مخصوص ہستیوں میں ہے جسے اکثر بڑے شاعروں نے سراہا ہے اور اپنے کلام سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

اسد اللہ خاں غالب ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

دیکھئے غالب سا جید شاعر میر کو ریختے کا استاد مانتا ہے اور اُن کی زبان پر فریفتہ ہے۔ دوسری جگہ غالب کہتا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

سبحان اللہ کیا جوشِ عقیدت ہے۔ اس شعر میں غالب نے اپنے کو اور ناسخ جیسے باکمال شاعر کو معتقدِ میر بتلا کر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ کلیدِ کامیابی و کمال اسی عقیدتمندی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ذوق کا ایک شعر ہے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ کسی شاعر کو میر کا اندازِ بیان نصیب نہ ہوا۔ میر تقی میر کے فاتحہ صد سالہ کے موقع پر مرزا رسوا کہتے ہیں ؎

اس غزل گوئی میں وہ تاثیر ہے مرزا کہ آج
سو برس کے بعد عالم نوحہ خواں ہے میر کا

دیکھیے سودا نے میر کو استاد مانا ہے فرماتے ہیں

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

مصحفی بھی "انداز سخن میر" کے دلدادہ ہیں۔ کہتے ہیں

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعویٰ
پھبتا ہے یہ انداز سخن میر کے اوپر

رند کے مرقومہ ذیل شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ رند نے میر کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس لئے وہ میر کی ممتاز خصوصیت یعنی سہل نگاری کا مداح ہے۔

تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میر سے
عاشق ہیں ہم تو رند اسی بول چال کے

دوسری جگہ کہتے ہیں

شیخ ناسخ خواجہ آتش کے سوا بالفعل رند
شاعران ہند میں لکھتے ہیں شعر میر کم

شیفتہ "شیوہ ہائے میر" کا شیدا کہتا ہے

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے

دیکھئے حضرت جلال فرماتے ہیں کہ طرزِ میر کو کوئی نباہ نہ سکا۔ میر کی شخصیت تمام شعراء سے الگ نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

گو جلال آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز لیکن سخن میر تقی میر کی کیا بات

”میر نکتہ سنج“ اپنے صوفیانہ اور حکیمانہ اشعار کی وجہ سے حضرت اثر کو صرف شاعر ہی نظر نہیں آتا بلکہ ولی معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بے شک کوئی ولی تھا اثر میر نکتہ سنج
سب شاعروں سے خاص ہے اس باخدا کا رنگ

جناب الطاف حسین صاحب حالی معترف ہیں کہ وہ مقلدِ میر ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حضرت امیر مینائی نے کلام میر کی کیسی سچی تعریف کی ہے فرماتے ہیں ؎

سودا و میر دونوں تھے کامل مگر امیر ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

جناب سید رضا علی وحشت نے میر کی تعریف میں ایک طویل نظم لکھی ہے۔ اس نظم کا پہلا بند یہ ہے ؎

خوشا وہ دل کہ جس میں قلزمِ غم کی ہو طغیانی
قلق جس کا ہے بے پایاں الم جس کا ہے طولانی
جہاں ہے عیش کی تقلیل کلفت کی فراوانی
برستی ہو اداسی اور ٹپکتی ہو پریشانی
وہیں قدر کلامِ خونچکانِ میر ہوتی ہے وہیں اس مصحفِ اندوہ کی تفسیر ہوتی ہے

آخری بند اس نظم کا ملاحظہ ہو قابلِ داد ہے ؎

نہ گزرا وادیٔ الفت کا ایسا رہنما کوئی
دلوں کے راز سے نکلا نہ اتنا آشنا کوئی
حریف اس کا بیانِ عشق میں وحشت نہ تھا کوئی
زمینِ ہند کیا ایران میں بھی کب ہوا کوئی

ہوا تغیر رنگ ایک ایک کی شیوا بیانی کا
ہلالی کا ضمیری کا شفائی کا فغانی کا

خواجہ آتش[13] فرماتے ہیں ؎

آتش بقولِ حضرتِ سودا شفیقِ من ہوتا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

دیکھئے حضرت ناسخ[14] کا وہ قول جس کا حوالہ غالب نے اپنے شعر میں دیا ہے ؎

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

جناب عیش[15] صاحب کس سچائی سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ دلکشی اور دلربائی میر کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے ؎

ہے سچ تو یہ شعرائے جہاں میں عیش فقط
کلام میر ہے البتہ دل پذیر اپنا

میر کے کلام میں جو دلکشی اور صفائی ہے میر مجروح[16] اس کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

یوں تو ہیں مجروح شاعر سب فصیح میر کی پر خوش بیانی اور ہے

عرش[۱۷] صاحب اس حقیقت کے اقرار میں ذرا پس و پیش نہیں کرتے کہ میر کی خصوصیت اور اندازِ بیان کسی شاعر کو نصیب نہ ہوا ؎

لاکھ تقلید کیجئے اے عرش — پر کب انداز میر آتا ہے

جناب شاد[۱۸] صاحب جن کو اُردو دانی کا دعویٰ ہے وہ بھی اپنا مقابلہ اگر کرتے ہیں تو میر ہی سے۔ کیونکہ زبان اُردو اگر آتی تھی تو اُن کے خیال میں صرف میر تقی میر ہی کو آتی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

میں ہوں وہ طوطیِ ہندوستاں شاد — زباں جس کی ہے مثلِ میر اُردو

مولوی اسمٰعیل[۱۹] صاحب اُستادی کا درجہ صرف میر ہی کو دیتے ہیں کہتے ہیں ؎

یہ سچ ہے کہ سودا بھی تھا اُستادِ زمانہ — میری تو مگر میر ہی تھا شعر کے فن میں

مرزا داغ[۲۰] کی زباں دانی کا کون قائل نہیں۔ وہ فرماتے ہیں ؎

میر کا رنگ برتنا نہیں آساں اے داغ — اپنے دیواں سے ملا دیکھئے دیواں اُن کا

لسان العصر حضرت اکبر[۲۱] کا فیصلہ سنئیے ؎

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبر — ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

حضرت مصحفی[۲۲] میر کو حافظِ ہند کہتے ہیں سنئیے ؎

ابیاتِ غزل میں حسنِ تاثیر وہی — ہر نغزِ دلکش میں ہم ذخیرہ وہی
حافظ کا جو فارسی میں ہے رتبۂ مصحفی — اُردو میں بھی ہے مرتبۂ میر وہی

میرے خیال میں کسی شاعرِ مشہور کا دیوان نہیں جس میں میر کے کمال کے اعتراف میں کوئی شعر موجود نہ ہو۔ زمانہ حال کے اکثر شعرا کی جناب خان بہادر

سید رضا علی صاحب وحشت کی طرح میر کی مدح میں مستقل نظمیں ہیں۔ مولانا عزیز لکھنوی۔ جناب فرخ بنارسی اور حضرت آثر لکھنوی کی نظمیں اس موضوع پر ملک کے مقتدر جرائد میں چھپ چکی ہیں۔

ہر شخص کا مذاق جداگانہ ہے اور ایک ہی شے مختلف افراد پر مختلف تاثرات پیدا کرتی ہے لیکن کلام میر میں کچھ ایسی دلکشی ہے اور اس میں ایسی خوبیاں مضمر ہیں جن کی وجہ سے ہر نکتہ سنج اس فرمانروائے اقلیم سخن کے حضور میں خراج تحسین ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہے۔ میرے خیال میں اردو کے کسی شاعر کی تعریف اتنے شاعروں نے نہیں کی ہے۔ یہ عالگیر مقبولیت میر تقی میر کا خاص حصہ ہے۔

تلامذۂ میر

میر کے شاگرد ہوئے مگر میر جس بلند پایہ کے استاد تھے اس درجہ کے شاگرد ان کو سوائے راسخ عظیم آبادی کے اور نہ ملے، ملتے کیونکر، میر سا گداختہ دل اور برگشتہ جگر ہونا کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، شاعری اور پھر میر کے رنگ کی شاعری، دل خراشی اور جگر کاوی کا نتیجہ ہے، چند شاگردوں کا نام لکھتا ہوں جو میر کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے۔

(۱) میر عبداللہ نثار۔

میر کے احباب میں تھے، اشعار آراستہ اور سنجیدہ کہا کرتے تھے، میر کو ان کی وضع بہت پسند تھی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

ٹک دیکھ تو چمن کا کیسا ہے ڈھنگ تجھ بن
منہ سے اُڑا ہے گُل کے گلشن میں رنگ تجھ بن

اکثر ہیں دل فگار ولیکن نہ اس قدر کتنے ہیں بے قرار ولیکن نہ اس قدر

(۲) میاں جگن :۔

میر لکھتے ہیں کہ "یہ فقیر کی شاگردی کا دعویٰ کرتا ہے" کہتے ہیں ؎

اس دل مریض عشق کو آزار ہی بھلا
چنگا ہو تو ستم ہے یہ بیمار ہی بھلا

(۳) محمد مُحسن :۔

یہ میر صاحب کے بھائی کے لڑکے تھے، میر صاحب کو ان کا اندازِ کلام اُمید افزا معلوم ہوا تھا، اور میر صاحب نے پیشین گوئی کی تھی کہ "انشاء اللہ بہت خوب کہے گا" کہتے ہیں ؎

دل مرا وابستۂ زنجیرِ زلفِ یار ہے ہے تو دیوانہ پر اپنے کام میں ہشیار ہے
اور یہ عاجز تمہارا کچھ نہیں رکھتا مگر جان برلب آمدہ حاضر ہے گر درکار ہے

(۴) مجنوں دہلوی :۔

مصحفی نے ان کو میر صاحب کا شاگرد لکھا ہے ان کا یہ شعر مشہور ہے [۱]

بیٹھا تھا مجھ کو دیکھ بہانے سے اُٹھ گیا حسن سلوک آج زمانے سے اٹھ گیا ؎

جس سے دل چاہے ملو تم نہ کسی سے پوچھو
مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے ہی جی سے پوچھو

(۵) عبداللہ خاں مشتاق :-

مصحفی نے اِن کو بھی میر کا شاگرد لکھا ہے۔ اِن کا شعر ہے ؎

خود کو روؤں یا اس دِل رہینِ نازِ پرور کو
کیا اک ترک نے غارت مرے لشکر کے لشکر کو

(۶) مرزا آغا حسین علی برشتہ لکھنوی :-

مؤلف "جلوۂ خضر" نے اِن کو میر کا شاگرد لکھا ہے اور اِن کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

ہر وقت ہم سے کرتا ہے وہ نوجواں دماغ
اتنا دماغ اٹھانے کا ہم کو کہاں دماغ

(۷) مرزا باقر علی فرخ آبادی متخلص بہ وحشت :-

صاحب "جلوۂ خضر" نے اِن کو بھی میر کا شاگرد لکھا ہے اور یہ شعر نقل کیا ہے ؎

دیکھ کر اس کو ہوا ہوں غش نہ آؤں ہوش میں
ہووے محشر کا اگر شور و فغاں بالائے سر

(۸) میر غلام حسین شکیبا

مولوی محمد حسین آزاد نے شکیبا کو میر کا شاگرد لکھا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

نیم بسمل اس نے گر چھوڑا شکیبا غم نہیں
یہ بڑے ہی اعتبار دست قاتل آگیا

ہمیں قتل تم نے کیا سر یا نہیں سکتے ہم کہ بُرا کیا ؎
یہ بھلا کیا ہوئے کیا، جو کوئی کہے کہ یہ کیا کیا

(۹) خواجہ محمد اکرام نزار :-

میر حسن نے ان کو میر کا شاگرد لکھا ہے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

نزدیک ہے مرنے کو وفا کشتہ نزار اب
ٹک دیکھنے چلئے تو بہت دور نہیں ہے

(۱۰) منشی بندرابن راقم :-

قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے بھی میر سے اصلاح لی ہے۔ وہ عبارت آرائی میں مشہور تھے اور برابر مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض ۔۔۔ مجھ کو قسم ہے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب ۔۔۔ آپس میں درد دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

(۱۱) لالہ منولال صفا لکھنوی :-

صاحب "جلوۂ خضر" نے ان کو بھی میر کے شاگردوں میں شمار کیا ہے، ان کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے، واقعی کیا خوب کہا ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں ۔۔۔ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(۱۲) شیخ خادم علی خادم :-

بقول صاحب "جلوۂ خضر" یہ بھی میر کے شاگرد ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

عاشق ہوا ہوں اک بت بالا بلند پر ۔۔۔ صد آفریں ہے میری بھی اعلیٰ پسند پر

مجھ کو کہتے ہیں کہ چل باہر ہو ۔۔۔ آپ کے کہنے سے کب باہر ہوں

(۱۳) میر احمد یار دہلوی متخلص بہ یار:-

"جلوۂ خضر" میں لکھا ہے کہ یہ بھی میر کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا یہ شعر عام پسند ہے ؎

آفریں اے دستِ گستاخِ محبت آفریں   پھر گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا

(۱۴) شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی:-

"شاعری کا صحیح مذاق رکھنے والے اور اوصاف میر کے دلدادہ ان کو ثانی میر تقی میر مانتے ہیں سنہ ۱۱۶۲ھ میں موضع سائیں ضلع عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ بقول گارسن دی تاسی سنہ ۱۲۴۰ھ میں ۷۸ برس کی عمر پاکر ۲۲ جمادی الآخر کو انتقال کیا۔" راسخ نے اپنے اشعار میں میر کے شاگرد ہونے کا اکثر جگہ دعویٰ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

راسخ کو میر سے تلمذ   یہ فیض ہے اُن کی تربیت کا

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ   استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا

کروں کیونکر نہ میں راسخ مباہات   کہ ہیں استاد میرے حضرت میر

بقول مولوی سید عزیز الدین صاحب بلخی مؤلف "تاریخ شعرائے بہار" "ثقاہت و متانت معنی میں یہ اپنے استاد میر سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں اور عشق حقیقی کے پاک جذبات کے بیان میں یہ اُن سے آگے ہیں۔"

راسخ کے تذکرہ میں مولانا عزیزالدین صاحب فرماتے ہیں کہ "راسخ نہ صرف سر دفتر شعرائے بہار ہیں بلکہ اقلیم سخن میرؔ و دردؔ کی طرح تمام ہندوستان کے لیے مایۂ افتخار ہیں"

راسخ کی مثنویوں کے بارے میں مولانا حسرت موہانی صاحب فرماتے ہیں کہ "ان سب مثنویوں کا انداز میرؔ کی مثنویوں سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں میں تمیز بھی مشکل ہی سے ہو سکتی ہے" نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعائے دل　　اس قید مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

اپنا بھی ماجرائے دل اک مرثیہ سا ہے　　بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر

ہے عزم ترک ہستی وجہ دوام ہستی　　جیتے ہی جی فنا ہو گر ہے بقا کی خواہش

میری متاعِ عجز بھی کی ناپسند ہائے　　بولے کہ اس متاع پہ تجھ کو غرور تھا

مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا　　دید کو اپنی یہ آئینہ اُسے درکار تھا

طالبانِ یار کی منزل تو غیر از دل نہیں　　کعبہ کہتے ہیں جسے وہ راہ ہے منزل نہیں

معاصرین میر

ولادت میر ۱۱۳۷ھ وفات میر ۱۲۲۵ھ

میر کے زمانہ میں بڑے بڑے شعرا تھے، فن شاعری میں میر کی بے مثال کامیابی اور شہرت دوام انھیں اساتذۂ فن کا فیض ہے۔ علمی صحبت اور مشاعروں کی شرکت میر کے ذوق سلیم کا سرمایہ ہیں۔ میر کے زمانہ کے اکثر شعرا مستند اور قابل تقلید مانے گئے ہیں۔ ذیل میں چند مشہور معاصرین کا ذکر کرتا ہوں۔

(۱) میر محمد حسین کلیم:۔

دلی کے رہنے والے تھے۔ مقبول انشا پرداز اور مشہور شاعر تھے۔ علوم عربیہ میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

لگتی ہے اب تو قلقل مینا سے دل کو ٹھیس
وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

تجھے میں آنکھوں میں کیونکر رکھوں کہ ہے برسات
پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے

(۲) خواجہ میر درد:۔

سید خواجہ میر نام اور درد تخلص تھا، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے تھے۔ شعرگوئی اور علم موسیقی میں طاق تھے۔

مطالعہ اور مذاکرہ میں صرف اوقات کرنا پسند کرتے تھے۔ تغزل، تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے میر درد کا کلام میر تقی سے زیادہ دلآویز اور جذبات انگیز ہے۔ ۱۱۹۹ھ میں انتقال کیا۔ کلام یہ ہے:-

ہوگیا سماں سرائے کثرتِ موہوم آہ — وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا — میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا — آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں — دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں

کچھ یاس سے تسکین دلِ مضطر کو ہوئی تھی — پھر چھیڑ دیا ہائے تمنا کا بُرا ہو

(۳) مرزا محمد رفیع سودا:- (ولادت ۱۱۲۵ھ - وفات ۱۱۹۵ھ)

سودا کے والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا، ان کی تربیت اور پرورش دلی میں ہوئی۔ بچپن ہی سے طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ کثرت مشق نے ان کی زبان چلا دی۔ ایک رسالہ عبرت الغافلین نام بھی لکھا ہے۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آدم کا جسم جبکہ عناصر سے مل بنا — کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

تو نے سوداؔ کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں ۔ یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ ۔ تو کہے گبر مجھے۔ گبر مسلماں مجھ کو

(۴) مرزا مظہر جانجاناں :-

شمس الدین جانجاناں نام اور مظہر تخلص تھا۔ ان کے باپ کا نام مرزا جان تھا، مالوہ میں پیدا ہوئے۔ علوی نسباً حنفی مذہباً اور نقشبند مشرب تھے، مزاج میں استغنا تھا اور نہایت متوکل تھے۔ اسی وجہ سے امرا اور بادشاہوں کے دربار میں حاضری سے پرہیز کرتے تھے۔

مرزا صاحب کا ایک دیوان فارسی میں ہے اور بقول میر تقی میر ان کا کلام کلیم و سلیم کے کلام سے کم رتبہ نہیں۔ اردو میں کوئی مکمل دیوان ان کا نہیں ملتا۔ غزلیں اور اشعار ہیں۔ کہتے ہیں ؎

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

لوگ کہتے ہیں موا مظہر بیکس افسوس ۔ کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

(۵) انعام اللہ خاں یقین :-

نواب اظہر الدین خاں کے بیٹے تھے۔ مرزا مظہر کے شاگرد رشید تھے۔ خوش رو اور خوش گو، خوش خلق اور خوش پسند جوان تھے۔ مصحفی کے تذکرہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۵ برس کے سن میں انتقال کیا۔ کلام ملاحظہ ہو ؎

جز نہیں یہ تجھ کو تقصیں ہے سزا تیری — بندہ جو تو بتوں کا ہو گیا خدا نہ تھا

تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ — یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

یہ سینہ عشق سے محروم درد و داغ نہیں — ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

(۶) شیخ قیام الدین قائم بجنوری:-

قیام الدین علی نام۔ قائم تخلص کرتے تھے، چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ مرزا رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام دیکھئے:-

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائم — شاید اس جنس کا کوئی بھی خریدار نہ تھا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن — بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

(۷) خواجہ احسن اللہ بیان:-

دلی میں پیدا ہوئے۔ وطن اکبر آباد تھا۔ مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد تھے اور مولانا فخر الدین دہلوی کے مرید۔ رائے گلاب چند

ان کے شاگردان رشید میں سے تھے سہل پسند اور ذہین طبیعت رکھتے تھے ۱۲۱۳ھ میں انتقال کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مصلحت ترک عشق ہے ناصح
لیکن ہم سے یہ ہو نہیں سکتا

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آسکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر

رسوا ابھی سے کرتی ہے اے چشم تر مجھے
آنا ہے اس کی بزم میں بار دگر مجھے

(۸) سید محمد میر سوز :- (ولادت ۱۱۳۳ھ وفات ۱۲۱۳ھ)

میر ضیاء الدین کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں انتقال کیا۔ شہسواری، خطاطی اور تیراندازی کے استاد تھے۔ شعر و سخن کا شوق کم سنی ہی سے تھا۔ پہلے میر تخلص کرتے تھے پھر سوز تخلص اختیار کیا۔ نمونۂ کلام دیکھئے ؎

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار پیدا کر

اہل ایماں سوز کہتے ہیں کہ کافر ہو گیا
آہ یارب راز دل ان پہ بھی ظاہر ہو گیا

اشک خوں آنکھوں میں آ کر جم گئے
دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

(۹) میر محمدی بیدار :-

دلی وطن تھا اور وہیں تعلیم و تربیت بھی ہوئی مرزا علی قلی بیگ [illegible] سے فارسی میں اور میر درد سے اردو میں اصلاح لی۔ دو دیوان یادگار چھوڑے ۱۲۰۹ھ میں انتقال کیا۔ ان کے اشعار بڑے دل آویز ہوتے ہیں ملاحظہ ہو :-

ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک   دل سے نہ ترے غبار نکلا

ہم تری خاطرِ نازک سے حذر کرتے ہیں   ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

جام و مینا و مئے و مطرب و ساقی ہمراہ   اس سرانجام سے بیدار کہاں جاتا ہے

شکوۂ کم نگہی آنکھوں سے اس کی نہ کرو   گفتگو خوب نہیں مردمِ بیمار کے ساتھ

(۱۰) حکیم ہدایت اللہ خاں۔ ہدایت

خواجہ میر درد کے شاگرد تھے، طبابت میں سربرآوردہ تھے۔ نہایت حلیم و سلیم تھے اور فصیح و بلیغ شعر کہا کرتے تھے۔ ۱۲۱۵ھ میں انتقال کیا نمونہ دیکھیے :-

رہا مرتے مرتے مجھے غم اسی کا   نہیں بعد میرے کوئی بے کسی کا

کیا تنگ نالوں نے جب کام اپنا   میں منہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا

(۱۱) حضرت عشق دہلوی عظیم آبادی :-

شیخ رکن الدین نام، عرف شاہ گھسیٹا۔ وطن مالوف دہلی تھا۔

شیخ محمد کریم فاروقی کے بیٹے، اور شاہ محمد فرہاد ابو العلائی کے نواسے تھے ایک مدت تک خواجہ مہدی خاں مرحوم کے ساتھ رہنے کے بعد حضرت عشق عظیم آباد چلے آئے اور حضرت مخدوم منعم پاک (جن کا مزار محلہ میتن گھاٹ میں ہے) کی خدمت میں رہ کر بقیہ عمر یاد الٰہی میں بسر کردی ۱۲۰۳ھ میں اس جہان فانی سے رحلت کی۔ حسب روایت تذکرۃ الصالحین اور رسالہ معارف پھلواری شریف ۶۶ سال کی عمر پائی۔

بقول مولوی کریم الدین مؤلف "تذکرہ طبقات الشعرا" آپ کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ پیرس میں گارسن دی تاسی کے پاس تھا، دیوان ریختہ کے علاوہ تصوف میں چند قلمی رسالے بھی اُن کی تصانیف سے ہیں، زمانہ کے اعتبار سے آپ خواجہ میر درد اور میر تقی کے ہم عصر ہیں اور اکثر ہم طرح غزلیں لکھی ہیں، نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

اوروں کا جگر یار جو تیروں سے سئے ہے — یہ عاشقِ جاں باختہ کس دن کے لئے ہے

عرش تا فرش کر جدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

آنکھیں پتھرا گئی ہیں آئینہ وار — کیا لکھوں انتظار کی صورت

داغ دل کا تو کبھی ہم سے مٹایا نہ گیا — یہ دیا وہ ہے جو دن کو بھی بجھایا نہ گیا

(۱۲) الم:

صاحب الم نام، خواجہ میر دردؔ کے صاحبزادے تھے ۱۲۱۵ھ میں انتقال کیا، فرماتے ہیں ؎

نے دن کو قرار بے قراری کے سبب نے شب ہی کو خواب اشکباری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھی یہ کچھ دیکھا تو تیری یاری کے سبب

(۱۳) شیخ محمد روشن جوشش عظیم آبادی:-

خواجہ میر دردؔ کی روش پر چلنا پسند کرتے تھے۔ ان کا دیوان شوق نیموی کے کتب خانہ میں ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

تعلقات جہاں کی خبر نہیں رکھتا ہزار شکر کہ میں درد سر نہیں رکھتا

غش آگیا وہ سامنے میرے جہاں ہوا مجھ کو وصال یار میسر کہاں ہوا

نہ کوئی دوست ہے میرا نہ کوئی دشمن ہے ایک یہ دل ہے بغرض دوست ہے یا دشمن ہے

جس طرح دل کا داغ جلتا ہے اس طرح کب چراغ جلتا ہے

(۱۴) ہیبت قلی خاں حسرت عظیم آبادی:-

مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد اور معتقد تھے سنہ ۱۲۰۱ھ میں اس دار محن کو خیرباد کہا۔ نہایت لطیفہ سنج اور حاضر جواب تھے، فیلن صاحب کا بیان

ہے کہ دیوان اردو کے علاوہ ایک قصہ "طوطی نامہ" بھی آپ کی تصنیف
تھا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہم نہ ہوں تو سب چرچا کریں   شمع ہے محفل میں پروانہ نہیں

کعبہ بھی ہم گئے نہ گیا ان بتوں کا عشق   اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

(۱۵) میر محمد باقر حزیں دہلوی ثم دہلوی :-

حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ ۱۱۵۸ھ میں عظیم آباد آکر نواب سعید احمد خاں صوبیدار بنگالہ کی رفاقت میں زندگی بسر کرنے لگے ۱۱۶۸ھ میں راہی ملک عدم ہو گئے۔ میر تقی میر اور سودا نے ان کو اکابر شعرا میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ مرزا سودا فرماتے ہیں ؎

داغ ہوں ان سے اب زمانے میں   بزم شعرا کے جو ہیں صدر نشیں
یعنی سودا و میر و قائم و درد   بے ہدایت سے تا کلیم و حزیں

میر غلام حسین شورش ان کے شاگردوں میں سر برآوردہ تھے۔
نمونۂ کلام دیکھئے ؎

ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

جو ہیں آنکھوں کے مخمور ان کو میخانے سے کیا نسبت
نگہ کے جو ہیں تشنہ ان کو پیمانے سے کیا نسبت

ہوا ہے تو حزیں دیوانہ اِن شہری غزالوں کا
تجھے صحرا سے اب کیا کام ویرانے سے کیا نسبت

(۱۶) سید خورشید علی خورشید بلگرامی۔ (۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا)
فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اشعار کہے ہیں۔ شیخ علی حزیں کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ اُن کا ایک شعر ہے۔

اس قدر بیتابیاں ہیں اس دلِ بیتاب کو ۔۔۔ بے قراری جس طرح آتش پہ ہو سیماب کو

(۱۷) شیخ محمد عابد دِل عظیم آبادی :۔
شیخ محمد روشن جوشش کے بڑے بھائی تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا ۔۔۔ اب تک دلِ مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا

دل میں ہمارے عشق کا جو درد ہے سو ہے ۔۔۔ چہرے کا میرے رنگ وہی زرد ہے سو ہے

(۱۸) میر غلام حسین خاں شورش عظیم آبادی :۔
مُلا میر وحید کے بھانجے تھے، میر باقر حزیں سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہم جو روتے ہیں لوگ ہنستے ہیں ۔۔۔ ہنستے ہی گھر سنا ہے بستے ہیں

اُٹھی یہ اُلفت گُل کے سبب سے ابتدا ۔۔۔ وگر نہ کیا تھا ہمیں باہم قفس و دام سے کام
رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش ۔۔۔ ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام

(۱۹) میر ضیاء الدین ضیا دہلوی ثم عظیم آبادی:-

میر حسن کے استاد تھے۔ مثنوی نگاری اور قصیدہ گوئی سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ ایک دیوان غزلوں کا چھوڑا ہے، انتخاب کلام ملاحظہ ہو ؎

رسوائیوں کی اپنے مجھے کچھ ہوس نہیں ناصح پہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

بھول کر بھی کبھی نہ یاد کیا ہم ترے جی سے ایسے بھول گئے

کل کی رسوائی تجھے کیا بس نہ تھی اے ننگ خلق

اس کے کوچے میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

(۲۰) مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر عاشق

مہاراجہ شتاب رائے کے لڑکے تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والدین نے حضرت شاہ عالم بادشاہ سے سند دیوانی حاصل ہونے کے بعد سے عظیم آباد میں بود و باش اختیار کی۔ عاشق نے ۶۳ برس کی عمر میں ۱۲۰۷ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان اور مثنوی مسمی بہ "زیبا" یادگار چھوڑا۔ ان کا ایک شعر یہ ہے ؎

مچایا ہے جگر نے حشر کا سا شور پہلو میں

مگر دیکھا ہے یہ حال دل رنجور پہلو میں

(۲۱) مرزا محمد علی فدوی دہلوی:-

۱۱۹۰ھ میں عظیم آباد چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کا دیوان مولوی سید ضمیر الحسن صاحب رئیس موضع گیلانی ضلع عظیم آباد

کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

ناتوانی مدد کرے اپنی   تیرے در پر ہوں مدام پڑا

بے خودی اور شرم سے باتوں کا کس میں ہوش تھا
وہ اودھر خاموش تھا کل میں ادھر خاموش تھا

وہ ہم پہ مہرباں کبھی تھے کبھی نہیں   جینے کا اب گمان کبھی ہے کبھی نہیں

پھرتے تھے ہم تو آنکھ بچائے چھپے چھپے   نکلا کدھر سے چاند جو آئے چھپے چھپے

غلط ہے دیدۂ تر سے جو ہم چشمی کرے شبنم
ہزار رونا آکر دیکھے اپنی پانی بھرے شبنم

چلی ساتھ کہ حسرت دل مرحوم سے نکلے   عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

متذکرہ شعرا کے علاوہ میر کے معاصرین اور بھی تھے مگر اُن کا بیان بخوف طوالت چھوڑ دیتا ہوں۔

میر و مرزا

میر و مرزا دونوں ہم عصر ہیں اور دونوں کچھ دنوں تک ایک دوسرے کے دوست تھے مگر کچھ دنوں کے بعد خبر نہیں کیوں اُن دونوں میں اختلاف ہوگیا اور آپس میں چوٹیں چلنے لگیں۔

چونکہ مدت سے میر و مرزا کو حریف و مقابل سمجھا گیا ہے اس لئے سرسری طور پر دونوں کا موازنہ کئے دیتا ہوں ورنہ میرے خیال میں ان دونوں کا موازنہ بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ دونوں کا رجحان طبیعت متباین ہے اور دونوں کی پسند متضاد۔ دونوں کی پسند الگ ہے اور

دونوں کی فطرت علیحدہ ہے۔

مرزا کو قصیدہ نگاری میں یدطولیٰ حاصل تھا اور وہ اپنے زمانہ میں بھی بحیثیت قصیدہ نگار کے مشہور تھے چنانچہ اس واقعہ کی طرف خود سودا اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں۔

کہتے ہیں وہ جو کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب   اُن کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

اور علی حیدر طباطبائی کہتے ہیں کہ "میر قصیدہ کہنا جانتے ہی نہیں"

مگر اس مشہور عام بات سے کہ میر کو مثنوی نگاری اور غزل سرائی میں کمال حاصل تھا اور سودا اُن کے مدمقابل نہیں ہیں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور علی حیدر طباطبائی کو اختلاف ہے اور ان کا خیال ہے کہ سودا کی غزلیں بھی میر کی غزلوں سے کم نہیں لیکن میرا خیال بھی یہی ہے کہ "میر کی غزلوں میں سودا سے زیادہ غزلیت ہے" اور سودا کے قصائد بحیثیت مجموعی میر کے قصائد سے زیادہ بلند پایہ ہیں۔ بہرکیف دونوں شاعروں کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو دونوں میں اس دور کے محاسن و عیوب ملیں گے۔ مثلاً

(۱) دونوں فارسی ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔
(۲) دونوں تشبیہہ و استعارات سے کام لیتے ہیں۔
(۳) دونوں کے کلام میں رعایت لفظی پائی جاتی ہے۔
(۴) دونوں کے کلام میں سُبکی اور ابتذال نمایاں طور پر ہیں۔
(۵) دونوں کے کلام میں جا بجا فحش ہے۔

(۶) دونوں کے کلام میں ناہمواری ہے۔
(۷) امرد پرستی کا عیب دونوں میں ہے۔
(۸) میر زندگی کا مغموم اور تاریک رخ پیش کرتے ہیں اور سودا وہ رخ دکھاتے ہیں جو خوشی سے مملو اور تاباں ہے۔
(۹) دونوں بزرگوار حقیقت نگار ہیں۔
(۱۰) سودا اور میر دونوں کے کلام میں سامعہ نواز الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔
(۱۱) دونوں شاعر ہندی کے الفاظ نہایت خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں۔

میر درد اور میر تقی

خواجہ میر درد، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الرشید تھے۔ آپ کا سلسلہ خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے ملتا ہے اور پچیس واسطوں سے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام تک پہنچتا ہے، دلی میں پیدا ہوئے اور علوم ظاہری اور باطنی میں کمال حاصل تھا۔ ان کا خاندان دلی میں پیری مریدی کے باعث نہایت محترم سمجھا جاتا تھا۔ میر درد بائیس برس کے سن میں سجادہ نشین ہوئے۔

خواجہ صاحب کا کلام سلاست زبان اور طرز ادا میں میر کے کلام سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ سودا اور میر ان کے ہمعصر تھے۔ سودا بھی خواجہ صاحب کے کمال کے معترف تھے، فرماتے ہیں ؎

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ اے بے ادب تو درد سے بس دو بدو نہ ہو

خواجہ میر درد صبر و قناعت کی تصویر تھے۔ دلّی کی غارتگری کے سبب میر۔ مصحفی۔ سوز۔ جرأت اور انشا جیسے اساتذہ باکمال گھر اور شہر چھوڑ کر تلاشِ معاش میں نکل گئے۔ مگر خواجہ صاحب اپنی خانقاہ میں سکونِ قلب اور روح پرور اطمینان کے ساتھ بیٹھے رہے۔

خواجہ صاحب کا انتقال ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ روز جمعہ کو اسّٹھ برس کی عمر میں ہوا۔ اُن کا مزار ترکمان دروازہ کے باہر ہے۔

(۱) میر تقی میر کی طرح خواجہ میر درد بھی چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہتے ہیں اُن سے اُن کی روانیِ طبع اور جوشِ بیان کا کمال ظاہر ہوتا ہے اور بقول مصنف آبِ حیات "تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے ہیں" ملاحظہ ہو

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی   ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی   جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

کچھ یاس سے تسکینِ دلِ مضطر کو ہوئی تھی
پھر چھیڑ دیا ہائے تمنا کا بُرا ہو

(۲) صاحبِ گلِ رعنا کا خیال ہے کہ "تصوف کے اعتبار سے ان کا کلام میر اور مرزا کے کلام سے زیادہ دل آویز ہے" کیوں نہ ہو، خاندانی بزرگ تھے اور صاحبِ کمال، بعض عارفین نکتہ رس کا یہ خیال ہے کہ میر کے کلام میں جو تصوف کی چاشنی ہے وہ خواجہ صاحب ہی کی صحبت اور

قریشی کا بیان ہے "بعض تذکرہ نویسوں کا یہ لکھنا کہ "تصوف کو ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا" بالکل صحیح ہے۔ معرفت اور حقائق تصوف کو اس خوبصورتی اور پاکیزگی سے بیان کر جاتے ہیں کہ دلوں پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔" ؎

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

خوابِ عدم سے جاگے تھے ہم تیرے واسطے آخر کو ہائے جاگ کے ناچار سو گئے

اس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

تیرے سوا نہیں کوئی دونوں جہان میں موجود ہم جو ہیں بھی تو اپنے گمان میں

مدرسہ یا دیر یا کعبہ تھا یا بت خانہ تھا ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

حجابِ رخِ یار بھی آپ ہم ہیں کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

(۳) صاحبِ گلِ رعنا فرماتے ہیں کہ "خواجہ صاحب کی زبان اور طرزِ ادا وہی ہے جو میرؔ کی ہے" مجھے بھی اس رائے سے کامل اتفاق ہے اگر مقطع نہ پڑھا جائے تو اکثر آدمی نہیں بتا سکتے کہ میرؔ کی غزل پڑھی جا رہی ہے یا دردؔ کی۔ مرزا عسکری مترجم تاریخ ادب اردو فرماتے ہیں کہ "اُن کی غزلیں

زبان کی سادگی اور صفائی بھی میر کے کلام کا مزا دیتی ہیں ۔

کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے   تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں   چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ   جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

کتنے بندوں کو جان سے مارا   کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما   اس طرف کو کبھو گذر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم   نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

(۴) خواجہ صاحب کے کلام میں بھی میر تقی میر کی طرح درد اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

نالہ فریاد آہ اور زاری   آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا   بس ہجوم یاس دل گھبرا گیا
میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات   پر مری نظروں کے ڈھب سے آگیا

درد ہم کو یہ رات دن تیرا   نالہ زار خوش نہیں آتا

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں   دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں

دل کس کی چشم مست کا سرشار ہو گیا   کس کی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

اس نے قصداً بھی میرے نالوں کو   نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا

(۵) خواجہ صاحب کے کلام میں وہی سوز و گداز ہے اور وہی جلوۂ حسرت و یاس جو میر کے کلام کا طرّۂ امتیاز ہے۔ کہتے ہیں ؎

نہ وہ نالوں کی ہے شورش نہ وہ آہوں کی ہے دھونی
ہوا کیا درد کو پیارے گلی کیوں آج ہے سونی

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر   میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا   آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے   معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

(۶) خواجہ صاحب نے بھی میر کی طرح پُر درد اور پُر جوش قطعات لکھے ہیں، اور آپ کے قطعے بھی میر ہی کے قطعوں کی طرح مشہور اور زبان زد خاص و عام ہیں ؎

زاہد ہو میرے جینے کو کہتا ہوں — پر نصیحت سے تری مرتا ہے مجھے
ورنہ ان بے مروتوں کے لئے — اور بھی ہو خراب کیا ہے مجھے

پوچھا میں درد سے کہ بتا تو سہی مجھے — اے خانماں خراب ترا ہے بھی گھر کہیں
کہنے لگا مکان معین فقیر کا — لازم ہے کیا کہ ایک ہی جاگہ ہو ہر کہیں
درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست — تو نے سنا نہیں ہے یہ مصرع مگر کہیں

نامۂ درد کو مرے لیکر — پاس جب یار کے گیا قاصد
پڑھ کے کہنے لگا وہ سر نامہ — کون سا یار ہے بتا قاصد
جس نے بھیجا ہے تیرے ہاتھ یہ خط — ہم نہیں اس سے آشنا قاصد

(۷) میر کی طرح اس مرد باخدا اور تارک الدنیا کی طبیعت کبھی ہجو سرائی کی طرف مائل نہ تھی۔

(۸) خواجہ میر درد کے کلام میں بھی ان کے ہمعصر میر اور سودا کے کلام کی طرح بعض ہندی کے وہ الفاظ پائے جاتے ہیں جو اب متروک ہیں۔ خواجہ صاحب کے یہاں بھی فارسی ترکیبیں اور فارسی محاوروں کے ترجمے پائے جاتے ہیں ؎

ہو گیا مہماں سرائے کثرت موہوم آہ
وہ دل خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

لازم ہے گوشہ شکنِ زلف میں تیری　　نالاں کوئی پڑا رہے مجھ سا شکستہ دل

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی　　افتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

خواجہ صاحب کبھی بھاشا زبان میں بھی شعر کہہ جاتے ہیں ملاحظہ ہو

گھر آن من میں سوچت ہیں جب پھول کوئی کھلاوت ہے
جا بن وا کے بیت گیو ہے ساون ہم کا آوت ہے

محاسنِ کلامِ میر

غزل

(۱) صاف اور سلیس اشعار شاعر کے کمالِ فن پر دلالت کرتے ہیں (۲) الفاظ کی مناسب ترتیب و ترکیب زبان میں ایک دلکش موسیقیت پیدا کرتی ہے (۳) چستی بندش اور فصاحت کلام شاعر کی شہرتِ دوام کی ضامن ہیں (۴) اخلاق اور حکیمانہ اصول کا مؤثر بیان، حسنِ کلام کو چار چاند لگا دیتا ہے (۵) سوز و گداز غزل کی جان ہے (۶) وارداتِ قلب اور احساساتِ داخلی کا بیان کلام میں ایک خاص گداختگی پیدا کر دیتا ہے اور یہ تمام خصوصیتیں میر کے اشعار میں بدرجہ کمال موجود ہیں (۷) تصوف میں بھی میر صاحب کا رتبہ کافی بلند ہے (۸) میر کی غزلوں میں **صنائع شعری** کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ (۹) فارسی زبان کی دل آویز **ترکیبوں** کو میر نے بڑی خوش اسلوبی سے استعمال

کیا ہے۔ (۱۰) کلام میر میں فصحا کے محاورے اور ضرب الامثال کی کمی نہیں (۱۱) ہندی الفاظ کو پیاری ترکیبوں سے نازک موقعوں پر استعمال کرنا میر کی امتیازی خصوصیت ہے ؎

(۱) میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی　　اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

میر کی زبان نہایت صاف شستہ۔ آسان اور دلکش ہے۔ بول چال معلوم ہوتی ہے۔ اس کی سادگی پہ ہزاروں بناوٹیں قربان۔ ایسی سیدھی سیدھی ترکیبیں ہیں کہ نثر اور نظم میں کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

بھلا اس نظم کی نثر کوئی کیا بنائے گا کتنا بلیغ مضمون ہے اور کس سادگی اور صفائی سے ادا کیا ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر　　پھر ملیں گے اگر خدا لایا

دیکھئے بول چال میں یوں مطالب ادا کئے جاتے ہیں۔ ایک اور شعر سنئے ؎

تاب کس کو جو حال میر سنے　　حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

(۲) میر اپنے اشعار میں الفاظ کی نشست اور ترکیبوں سے عجیب موسیقیت اور ترنم پیدا کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریشم کی ڈوری میں مختلف جواہرات پرو دیے گئے ہیں۔ اکثر اشعار سامعہ نواز اور لذت بخش کام و دہان ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

زیست ایک جانِ وبال ہے، کوئی دم جو ہے سو عذاب ہے
دلِ داغ گشتہ کباب ہے، جگرِ گداختہ آب ہے
کبھو لطف سے نہ سخن کیا، کبھو بات کہہ نہ لگا لیا
یہی لحظہ لحظہ خطاب ہے، یہی لمحہ لمحہ عتاب ہے
رکھو آرزو مئے خام کی، کرو گفتگو خطِ جام کی
کہ سیاہ کاروں سے حشر میں، نہ حساب ہے نہ کتاب ہے

ایک اور شان ملاحظہ فرمائیے۔ کہتے ہیں ؎

عالم عالم عشق و جنوں ہے، دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں، صحرا صحرا وحشت ہے

دوسری ترکیب دیکھیے۔ ہر انداز خاص طور سے پیارا ہے ؎

سحر کو محرابِ تیغِ قاتل کبھو جو یارو ادھر ہو مائل
تو ایک سجدہ بسانِ بسمل مری طرف سے ادا کرو گے

(۳) میر کے کلام میں وہ بے ساختگی اور قابلِ داد آمد ہے کہ اکثر اشعار پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ چستی، بندش اور فصاحت سے تمام کلام مملو ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

نہ تو جذب رسا نہ بخت رسا   کیونکہ کہئے کہ واں رسائی ہے

گل قفس تک بہار لائی ہے   لو کہ پھر کر بہار آئی ہے

تیرے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے   خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے

چشم سے خوں ہزار نکلے گا   کوئی دل کا بخار نکلے گا

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس
اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

(۴) میرؔ صاحب حکیمانہ اور واعظانہ مضامین کو نہایت مفید اور مؤثر طریقے سے بیان کر جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

مرگ اِک زندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

نیرنگیِ عالم پر غائر نگاہ کرنی اور اُس سے پیچیدہ مسائل کو استنباط کرنا اور اس کو عام فہم طریقہ سے کہہ جانا بھی میرؔ ہی کا کام ہے۔ کہتے ہیں ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا   یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر   میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

دیکھئے پند و نصیحت کرنے کا فرض کس خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دُکان شیشہ گر ہے

رواداری اور تحمل کی تلقین کرتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ "بھلا بھائی بھلا ہوگا"

اہم مسائل کو اس سادگی سے بیان کر جاتے ہیں کہ سرسری طور پر پڑھنے سے خیال نہیں ہوتا کہ ان سلیس الفاظ میں بڑے بڑے نکات کہہ دیئے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

سرسری تم جہان سے گزرے   ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں   نادان یہاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

(۵) میرؔ کے اشعار کی روحِ رواں وہی سوز و گداز ہے جو بقول شبلی غزل کی جان ہے۔ اظہارِ سوزِ دل کے لئے پیکرِ درد و غم میرؔ شعر کہا کرتا ہے

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے   درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں ؎

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے کچھ دردِ سا دل میں ہوتا ہے
میں راتوں کو رویا کرتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا   دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

سحرگہ عید میں دورِ سبو تھا   پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز   اُسی خانہ خراب کی سی ہے

(۶) وارداتِ قلب۔ احساساتِ دماغی اور نظریاتِ محبت کا بیان

میر سے بہتر کسی نے نہیں کیا۔ چونکہ میر اس وارثت میں ایک دردمند دل لے کر آئے تھے اور اُن کو اس دُنیا میں سوائے رنج و الم کے اور کچھ نمایاں طور پہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ابتدائے محبت کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں ؎

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن   سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

رضائے محبوب کی جستجو کا اظہار کس خوبی سے کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہنگامہ میری نعش پہ تیری گلی میں ہے   لے جائیں گے جنازہ کشاں یاں سے کب مجھے

اضطرابِ دل اور شوقِ کوئے یار کا نقشہ اس شعر میں کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر   ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

محبت میں گریہ مستقل ہی سے کچھ تسکین ہو سکتی ہے فرماتے ہیں ؎

مستقل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل   ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

دیوانۂ اُلفت کو نصائحِ خردمندانہ سے ایذا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کہنے سے میرے اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو

واردات قلب کے بیان کرنے ہی کے لئے میر شعر کہا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا   وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

(۷) میر صاحب کی غزلیات میں عارفانہ اور صوفیانہ مضامین بھرے پڑے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ میر صاحب کی تربیت سید امان اللہ کی نگرانی میں ہوئی جو ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ سید امان اللہ کے علاوہ میر صاحب کو اور صوفیوں اور بزرگوں کی بھی صحبت میں شریک ہونے کا موقع ملا اور اُن کے اقوال و افعال پر توجہ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی اور پھر خود میر صاحب کی زندگی چونکہ آلام و مصائب کی ایک طویل زنجیر تھی۔ اُن کے کلام میں رس اور درد آگیا۔ چند اشعار مثال کے طور پر درج کرتا ہوں ؎

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک   سر سے سودائے جستجو نہ گیا

جز مرتبہ کل کو حاصل کرے ہے آخر   یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

حق ڈھونڈنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ   عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا

اس واقعہ کی طرف کہ بے وقوف انسان نے بار خلافت اُٹھا لیا اشارہ کرتے ہیں ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی   اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

خدا ہی کا جلوہ ہر جگہ ہے اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ؎

اس کے فروغ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور

شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

(۸) میر نے صنائع و بدائع کا استعمال نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی خاص صنعت کے استعمال کی کوشش کی گئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے
کھو بیٹھے جو آپ کو تو اس کو پائیے

بسکہ ہیں اس غزل میں شعر بلند   یہ زمیں آسمان ہے گویا

جو معتقد نہیں ہے علی کے کمال کا   ہر بال اس کے تن پہ ہے موجب وبال کا
حیرتِ روئے گل سے مرغِ چمن   چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا

میر کو خود اپنی صلاحیتِ استعمال صنائع و بدائع پر ناز ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اس صنائع کا اس بدائع کا   کچھ تعجب نہیں خدائی سے

(۹) میر فارسی ترکیبوں کو کس خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، ملاحظہ ہو ؎

سمجھ کر ذکر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح
وہی میں ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں

پیاری پیاری فارسی ترکیبیں اس انداز اور خوش مذاقی کے ساتھ استعمال کر جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چابکدست اور خوش پسند جوہری نے

؎ اشعارِ میر۔

کسی نازک طلائی زیور میں جواہر ریزے جڑ دئے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

دوسری مثال ملاحظہ ہو ؎

کرے ہے جس کو ملامت جہاں وہ میں ہی ہوں اجل رسیدہ۔ جفا دیدہ۔ اضطراب زدہ

چند اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا

آتے ہی تیرے ابرِ عرقناک نم زدہ سے حیران ہوں کہ آج کدھر کو کرم ہوا

پہنچا قریبِ مرگ کے وہ صیدِ ناقبول جو تیری صیدگاہ سے ٹک دور ہو گیا

فارسی میں کسی چیز کی کثرت کا اظہار تکرار الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں۔ میر نے بھی اس طریقہ کو استعمال کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

عالم عالم عشق و جنوں ہے دُنیا دُنیا تہمت ہے

دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

میر نے فارسی محاوروں کا ترجمہ بھی اپنے شعر میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

میرے حضور شمع نے گریہ جو سر کیا (گریہ سر کردن)

رویا میں اس قدر کہ مجھے آب لے گیا (آب بُرد)

بہ بھی گیا بدن کا سب گوشت ہو کے پانی
اب کارد اے عزیزاں پہنچا ہے استخواں تک (کارد باستخواں رسیدن)

(۱۰) اردو کے مشہور محاورے اور زبان زد ضرب الامثال میر کے کلام میں بکثرت موجود ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

نکلی تھی تیغ بے دریغ اس کی میں ہی اک امتحان سے نکلا

سُنا ہے حال ترے کشتگاں بچاروں کا ہوا نہ گور گڑھا ان ستم کے ماروں کا

دل مجھے اس گلی میں لے جاکر اور بھی خاک میں ملا لایا

لکھے ہے کچھ تو کج کر چشم و ابرو براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو

غمزہ نے اس کے چوری میں دل کے ہنر کیا
اس خانماں خراب نے آنکھوں میں گھر کیا

لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں آنکھیں اگر یہی ہیں تو بھر نیند سوچکا

جائے ہے جی نجات کے غم میں ایسی جنت گئی جہنم میں

(۱۱) میر جس طرح فارسی ترکیبوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کرتے

ہیں اسی طرح ہندی الفاظ بھی نہایت خوش سلیقگی سے اپنے اشعار میں
کھپا جاتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

نالہ تا آسمان جاتا ہے ۔ شور سے جیسے بان جاتا ہے

کل ہم سے اس سے بارے ملاقات ہوگئی
دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہوگئی

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی ۔ بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

گو وہ ہرجائی آئے اپنی اور ۔ سو طرف ہی گمان جاتا ہے

ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز ۔ باغ ہے گھر ہمارا صیاد

عیوب کلام میر

ایک ناقد کا یہ ناگوار فرض ہے کہ کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرتے وقت اس کے کلام کے محاسن کے ساتھ ساتھ عیوب کلام کو بھی ظاہر کر دے۔ سرسری طور پر دیکھنے سے میر کے کلام میں مندرجہ ذیل چند عیوب پر نظر پڑتی ہے۔

(۱) میر کے بعض اشعار نہایت مبتذل اور لغو ہیں۔ کہتے ہیں ؎

تو شملہ جو رکھتا ہے خر ہے وگرنہ ۔ ضرورت ہے کیا شیخ دم اک وجب کی

خوف ہم کو نہیں جنوں سے کچھ یوں تو مجنوں سے ہی چھپا ہیں ہم

ڈاڑھی سفید شیخ کی تو مست نظریں کر بگلا شکار ہوئے تو گتے ہیں ہاتھ پر

گر قصد ادھر کا ہے تو ٹک دیکھ کے آنا یہ دیر ہے زاہد نہ ہو خانۂ ...... خالا

شیخ ہو دشمن زن رقاص کیوں نہ القاص لایحب القاص

(۲) میر کی غزل میں سخت ناہمواری پائی جاتی ہے۔ ایک غزل میں ایک شعر بہت عالی اور بلند اور دوسرا بالکل پست وسست ہے۔ ایک شعر کی زبان سادہ اور سلیس ہے تو دوسرا مغلق اور نامانوس الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ ایک شعر میں نکات معرفت و مذہب ہیں تو دوسرے میں فحاشی اور بدزبانی ہے۔

(۳) میر کے کلام میں مرد کو معشوق بنانے سے غیر فطری مضامین پیدا ہو گئے ہیں ...... فرماتے ہیں ؎

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جسکے سبب اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

دلی کے کج کلاہ لونڈوں نے کام عشاق کا تمام کیا

کوئی عاشق نظر نہیں آتا — ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

جی لیا بوسہ رخسار مخطط دے کر — تھا قیمت اگر بوسہ تو کیوں زہر دیا پان کے بیچ

تیرا رخِ مخطط قرآن ہے ہمارا — بوسہ بھی لیں تو کیا ہے ایمان ہے ہمارا

(۴) میر کی غزلوں میں تعلّی کے اشعار بہت ہیں اور ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اکثر شعرا کو جاہل اور نافہم سمجھتے تھے اور اپنا مدمقابل کسی کو نہیں مانا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

یک پرچہ اشعار سے منہ باندھے سبھوں کے
جادو تھا مرے خامے کی گویا کہ زباں میں

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر — سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو — چاہیے اہلِ سخن میر کو استاد کریں

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو — لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں

(۵) میر کے اشعار میں عیب تعقید بھی پایا جاتا ہے ؎

ہر چند ناتواں ہیں پر آ گیا جو جی میں ‏ ‏ دیں گے ملا زمیں سے تیرا فلک قلابا

(۶) بعض اشعار میں غیر مانوس ترکیب بھی پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کیونکر تو میری آنکھ سے ہو دل تلک گیا ‏ ‏ یہ بحر موج خیز تو عسر العبور تھا

(۷) کبھی فارسی ترکیبوں کے ناجائز مصرف اور کبھی کثرت اضافت سے میر کے بعض اشعار خصوصاً جو بڑی بحروں میں ہیں پیچیدہ ہو گئے ہیں ایک جگہ میر نے اس کا خود اقرار کیا ہے اور یہ محض شاعری نہیں بلکہ سچی بات منہ سے نکل گئی ہے ہاں ہر شعر پیچیدہ نہیں ہے بعض اشعار ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

زلف سا پیچدار ہے ہر شعر ‏ ‏ ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

ہے زلف دروئے یار سے ہر لحظہ بحث یاں ‏ ‏ یہ وجہ ہے کہ شعر مرا پیچدار ہے

رُباعیات

اُترا تھا غریبانہ کنارے آکر ‏ ‏ لب خشک ہوا سو نور چشم حیدر
تر حلق دم آب سے اُس کا نہ ہوا ‏ ‏ اے آب فرات خاک تیرے سر پر

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے ‏ ‏ کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو کڑے رہتے جنوں ہوتا ہے ‏ ‏ اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک پر خاک سے اس کو بھر دیا ہے میں نے

بتخانے سے دل اپنے اٹھائے نہ گئے کعبے کی طرف مزاج لائے نہ گئے
طور مسجد کو برہمن کیا جانے یاں مدت عمر میں ہم آئے نہ گئے

حیرت ہے کہ رقیب محرم تیرا ہمراز و انیس وقت و ہمدم تیرا
جوں عکس ترے سامنے اکثر وہ ہو جوں آئینہ منہ تکا کریں ہم تیرا

دل خون ہوا ضبط ہی کرتے کرتے ہم ہو رہے چپکے دکھوں کے بھرتے بھرتے
اے مایۂ زندگی ستم ہے یہ اگر پھر آنکھ تجھے دیکھیں نہ مرتے مرتے

ہم میر برے اتنے ہیں وہ اتنا خوب متروک جہاں ہم ہیں وہ سب کا محبوب
ہم ممکن اسے وجوب کا ہے رتبہ ہے کچھ بھی مناسبت کا باہم اسلوب

اب شہر کی گلیوں میں جو ہم ہوتے ہیں منہ خون جگر سے دمبدم دھوتے ہیں
یعنی کہ ہر ایک جا پہ جوں ابر بہار عالم عالم جہان جہاں روتے ہیں

اندیشۂ مرگ سے ہے سینہ ریش ٹکڑے ہے جگر جیسے لباس درویش
ہاتھوں سے جو آج ہو سکے کر لیجے پھر کل تو ہمیں ہے اک قیامت درپیش

حاصل نہیں دنیا سے بجز دل ریشی رکھتی نہیں اعتبار یاری خویشی
توفیق رفیق ہو تو سب کر کے ترک بہتر بھی یہی ہے کہ یک چند کریں درویشی

تا چند تلطف ترا حیا سے ہوگا شائستۂ صد ستم وفا سے ہوگا
کر ترک ملاقات بتاں سب سے چل ان سے ہوگا سو اب خدا سے ہوگا

چپکے رہنا نہ تیرے دل میں ٹھانو بولو چالو کہا ہمارا مانو
اک حرف نہ کہہ سکوگے وقت رحلت چلنے کو زبان کے غنیمت جانو

یاروں کو کدورتیں ہیں اب تو ہم سے جس روز کہ ہم جائیں گے اس عالم سے
اس روز کھلے گی صاف سب پر یہ بات اس بزم کی رونق تھی ہمارے دم سے

تیرا اسے دل پہ غم فزوں کبھی ہوگا اندیشۂ رزق کم کبھو بھی ہوگا
کھانے کو دیا ہے آج جس نے تجھ کو کل بھی دیوے گا کل جو تو بھی ہوگا

مجنوں کی کوئی اس کی روایت نہ سنی — بے صرفہ کبھو وقت حکایت نہ سنی
تھا میر عجب فقیر صابر شاکر — ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ سنی

کچھ خواب سی ہے میر یہ صحبت داری — اٹھ جائیں گے یہ بیٹھے ہوئے یکباری
کیا آنکھوں کو کھولا ہے تنک گوش کو کھول — افسانہ ہے پل مارتے مجلس ساری

مستی نہ کر اے میر اگر ہے ادراک — دامان بلند ابر نمط رکھ تو پاک
ہے عاریتی جامۂ ہستی تیرا — ہشیار کہ اس پہ نہ پڑے گرد و خاک

کیا تم سے کہوں میر کہاں تک روؤں — روؤں تو زمیں سے آسماں تک روؤں
جوں ابر جہاں جہاں بھرا ہوں غم سے — شایستہ ہوں رونے کا جہاں تک روؤں

کیا کیا اے عاشقی ستایا تو نے — کیسا کیسا ہمیں کھپایا تو نے
اول کے سلوک میں کہیں کا نہ رکھا — آخر کو ٹھکانے ہی لگایا تو نے

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے — ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے اک خلق — خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

ہر صبح شفق میں شام کی ہے ہم نے — خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

اب وقت عزیز کو تو یوں کھوؤ گے — پر سوچ کے غفلت کے تئیں روؤ گے
کیا خواب گراں پہ میل روز و شب ہے — جاگو ٹک میر پھر بہت سوؤ گے

پوچھو نہ کچھ اس بے سروپا کی خواہش — رکھتی نہیں حد اہل وفا کی خواہش
جاتے ہیں چلے جی بھی بتوں کی خاطر — معلوم نہیں کیا ہے خدا کی خواہش

ہرچند کہ طاعت میں ہوا ہے تو پیر — پر بات مری سن کہ نہیں بے تاثیر
تسبیح نمط پھرنے سے کیا کام چلے — منکے کی طرح دل نہ پھرے جب تک میر

راضی ٹک آپ کو رضا پر رکھیے — مائل دل کو تنک قضا پر رکھیے
بندوں سے تو کچھ کام نہ نکلا اے میر — سب کچھ موقوف اب خدا پر رکھیے

ہم سے تو بتوں کی وہ حیا کی باتیں — وہ طرز کلام اس ادا کی باتیں
دیکھیں قرآں میں فال غیروں کے لیے — کیا ان سے کہیں یہ ہیں خدا کی باتیں

حمد

ثنائے جہاں آفریں سے محال
زباں اس میں جنبش کرے کیا مجال
کمالات اس کے ہیں سب پر عیاں
کرے کوئی حمد اس کی کیا بیاں
کہوں کیا میں اس کی صفات کمال
کہ ہے عقل کا یاں پریشاں خیال

- -

- -

یہ صنعت گری اس ہی صانع سے آئے
کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے
نہ آوے کسی کے جو ادراک میں
سو رکھ جائے وہ اس کفِ خاک میں
بری ہے گا تمثیل و تشبیہ سے
منزّہ ہے وہ بلکہ تنزیہ سے
وہ ہے حاصل مزرعِ آسماں
کئے ان نے دانے میں خرمن نہاں

- -

- -

سوا اس کے نقصاں ہے گر دیکھئے
کمال اس کے ہی ہیں جدھر دیکھئے
سررشتہ ہے خلق کا اس کے ہاتھ
وہ شب باز ان پتلیوں کے ہے ساتھ
سبھوں میں نمود اس کی ہی شان ہے
یہ قالب ہیں سارے وہی جان ہے

- -

- -

سما ارض و خورشید یا ماہ ہے — جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے
نظر کر کے ٹک دیکھ ہر جا ہے وہ — نہان و عیاں سب میں پیدا ہے وہ
بصورت آئینہ یکتا جہاں
یہ سب عکس اس کے ہی پڑتے ہیں یاں

نعت

ثنا جانِ پاکِ محمد کے تئیں — درود و تحیات احمد کے تئیں
رسولِ خدا و سرِ انبیا — زہے حشمت و جاہ نسلِ علی
دیا مجلسِ کبریا کا ہے وہ — شرف دودمانِ قضا کا ہے وہ
سب اس صفحے میں ہیں ظہورِ خدا — پر اس سے عبارت ہے نورِ خدا
جہاں وہ ہے واں جبرئیلِ امیں — اڑے حشر تک تو پہنچتا نہیں
کروں اس کی قربت کا کیا میں بیاں — کہ تھا "قاب قوسین او ادنیٰ" مکاں
مرا زیرِ پا اس کے فرقِ نیاز — کیا جس کی خلقت پہ صانع نے ناز

. . . .

نہیں پا شکستوں کا اب دستگیر — محمد بن اور آل بن اس کے بغیر
گنہگار ہوں چشم اک اس سے ہے — توقع شفاعت کی اک اس سے ہے
درود آل پر اس کے ہر صبح و شام
وہ ہے شافعِ حشر و خیر الانام

تعریف آغا رشید خطاط

میر خطاط یک قلم دیکھے — لیکن آغا سے لوگ کم دیکھے
یعنی عبدالرشید تھا استاد — خوشنویسی کی جس نے دی ہے داد
خط کی خوبی کا اس کی اب تک ڈھنگ — صفحۂ روزگار پر ہے رنگ
وہ تصرف کہیں جو کرتا ہے — شکل نقاش رنگ بھرتا ہے
حیرت افزا ہے حسنِ ہر تحریر — مشق اس کی ہے قطعۂ تصویر
خطِ شیریں جو اس کا پاتے ہیں — ہم حلاوت بہت اٹھاتے ہیں
لگ گئی ہے قلم تو جادو ہے — مد جہاں ہے کسو کی ابرو ہے

خط ہیں کیا ساری کوئی کامل ہو — اس کا کب نقطۂ مقابل ہو
حرف کس کس ادا سے لکھتا ہے — کون ایسے صفا سے لکھتا ہے
ہے الف قامتِ نکو رویاں — لام ہے زلفِ سلسلہ مویاں
دال کا خم رہے ہے ایسا خوب — جیسے جھکتے ہیں مست ہو محبوب
میم جس لطف سے لبالب ہے — دہنِ تنگِ مہوشاں کب ہے
ہے کشش قاشۂ تنِ خوباں — دائرہ دورِ دامنِ خوباں
دائرہ نون کا اس نمط کھینچا — کہ خطِ دلبراں پہ خط کھینچا
مدعی کو جو خط دکھائیں ہم — جیسے حرفِ غلط اٹھائیں ہم

مخمس

شکایتِ روزگار

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا ضعفِ قویٰ سے دستِ بپا بار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلبگار واں گیا چارہ نہ دیکھا مضطرِ ناچار واں گیا
اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پہ ہر اک ولی کے سماجت مری گئی نالائقوں سے ہائے لیاقت مری گئی
کیا مفت ہائے شانِ شرافت مری گئی ایسا بھرا یا اس لئے کہ طاقت مری گئی
مشہورِ شہر اب ہوں سبکسار بے وقار

پرداخت میری ہو نہ سکی اک امیر سے عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
رخنے ہمیشہ آتے رہے سر پہ تیر سے ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے
لیکن ہوا نہ رفع مرے دل کا اضطرار

حاجت مری روا دلِ پُر درد نے نہ کی تاثیر اشک سرخ رُخِ زرد نے نہ کی
تدبیر ایک دم بھی دمِ سرد نے نہ کی دل جوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں گیا جان سے قرار

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ ہے نام مجلسوں میں مرا میر بد دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

مذمت برشگال

کیا کہوں اب کے کیسی ہے برسات　　جوشِ باراں سے بہہ گئے ہیں پات
بوند تھمتی نہیں ہے اب کے سال　　چرخ گویا ہے آب دہ غربال
دہر یکساں اندھیر برسے ہے　　آسماں چشم واکو ترسے ہے
ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں　　تارے ڈوبے ہوئے اچھلتے نہیں
چرخ تک ہو گیا ہے پانی جو　　ماہ و ماہی ہیں ایک جا ہر دو
لے زمیں سے ہے تا فلک غرقاب　　چشمۂ آفتاب ہے گرداب
سقف گل مینھوں نے سب کی کھودی ہے　　بات باراں نے یاں ڈبوئی ہے
جیسے دریا اُبلتے دیکھے ہیں　　یاں سو پرنالے چلتے دیکھے ہیں
ابرِ رحمت ہے یا کہ زحمت ہے　　ایک عالم غریقِ رحمت ہے
لے گئے ہیں جہان کو سیلاب　　نقشۂ عالم کا نقش تھا بر آب
روز و شب یاں ہمیشہ جھمکا ہے　　ان دنوں رنگِ برق چمکا ہے
آدمی ہیں سو کب نکلتے ہیں　　مردمِ آبی چلتے پھرتے ہیں
معبد اب سارے گرتے آتے ہیں　　زاہدِ خشک ڈوبے جاتے ہیں
تھا ٹھہرنا برابر ان کے شاق　　مسجدوں نے کیا ہے استغراق
شعر کی بحر میں بھی ہے پانی　　بہتی پھرتی ہے اب غزلخوانی
لائی بارندگی کی چالاکی　　لبِ خشک گریہ نمناکی

ہے زراعت جو پانی سے ساری — ہوگئی آب خستہ کاری
آب ہے گا جہاں کے سرتاسر — خون سے سوکھتا ہے میوہ تر
ہر طرف ہے نظر میں ابر سیاہ — پانی ہے جس طرف کو کرے نگاہ
پانی عالم کے تا بسر ہوگا — خشک مغزوں کا مغز تر ہوگا

کیجے کیا میر مینہ کی ویرانی
ہوگئی ہے سیاہی بھی پانی

گھر کا حال

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال — اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے — سخت دل تنگ یوسف جاں ہے
کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ — کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم — تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی — آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
کیا کہے پنبہ سقف چھلنی تمام — چھت سے آنکھیں لگی رہی ہیں مدام
اس چکش کا علاج کیا کیجے — راکھ سے کب تلک گھڑے بھریے
جا نہیں بیٹھنے کو بیٹھ کے بیچ — ہے چکش سے تمام ایوان کیچ
آنکھیں جھڑ لگے پہ کہیں ہیں سب — کیونکہ پردہ رہے گا یارب اب
جھاڑ باندھا ہے مینہ نے دن رات — گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات

باؤ میں کانپتے ہوں جو تھر تھر — اُن پہ ردا رکھے کوئی کیونکر
کھینچے لپکے مارے چھوپا ہے — چھوپنا کا ہے کا ہے تھوپا ہے
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واقع — سو شکستہ تر از دل عاشق
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں — پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے — جی اسی حجرہ ہی میں پھرتا ہے
آگے اس حجرے کے ہے اک ایواں — وہی اس تنگ خلق کا ہے مکاں
سڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ — اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کہیں کوئی تھپولیا ہے پڑا رہے — کہیں چھپر [illegible]
کوئی کھٹولا کہیں سے ٹوٹا ہے — کوئی واسا مکاں سے چھوٹا ہے

دبا کے مرنا ہمیشہ مدنظر
گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر

گھر کی حالت کثرت بارش میں

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے — اُس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے
ظلمتیں اس کی [illegible] روشن ہیں — زندہ در گور ہم سے تن ہیں
ہے جو سر کوب آن پڑی دیوار — واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار
بخت بد دیکھ سارے پرنالے — اس کے معمار نے ادھر ڈالے
اب جو آیا ہے موسم برسات — دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات

صحن میں آب نیزہ بالا ہے　　کوچہ موج ہے کہ نالا ہے
دل ہے کچھ کڑیوں کا احسانمند　　کہ جنھوں نے کیے ہیں چھاتے بند
پھونس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے　　بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے
کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو　　باندھتا ہوں مچان رہنے کو
ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپر کے　　بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے
تاگلے سب گھرے ہیں پانی میں　　خاک ہے ایسی زندگانی میں
اب تو اپنا بھی حال ابتر ہے　　سر پہ کٹھری ہے تس پہ چھپر ہے
گھر کی حسرت جو اور ہوتی ہے　　چھت بھی بے اختیار روتی ہے
بیٹھ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا　　کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
واسطے پایان کار ٹوٹ گئے　　طاقچے بھر رہے تھے چھوٹ گئے
بہتی کولی تختے ڈوب گئے　　غرض اجزائے سقف خوب گئے
لے گیا پیچ و تاب پانی کا　　کوٹھری تھی حباب پانی کا
یوں ڈھا گھر کہ بار خاطر تھا　　آہ کس کا غبار خاطر تھا
اکھڑی دہلیز سب منڈیر گری　　لہر پانی کی جھاڑ دیتی پھری
ساری بنیاد پانی نے کھالی　　اینٹ سے گھر کو کر دیا خالی
جب اجارے پہ آکے چھت ٹھہری　　ہم سبھوں میں یہ مصلحت ٹھہری
آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں　　کیسو ٹٹی پہ بیٹھ کر نکلیں
دب کے مرنے سے ڈوب مرنا خوب　　ہے کنارہ یہاں سے کرنا خوب

محبت

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

محبت مسبب، محبت سبب
محبت سے آتے ہیں کار عجب

محبت بن اس جا نہ آیا کوئی
محبت سے خالی نہ پایا کوئی

محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت ہی سب کچھ زمانے میں ہے

محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ
محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ

محبت اگر کارپرداز ہو
دل آوارہ کنج غم سے ساز ہو

محبت سے ہے آب رخ کار دل
محبت سے ہے گرمی آزار دل

محبت عجب خواب خوں ریز ہے
محبت بلائے دل آویز ہے

محبت کی ہیں کارپردازیاں
کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں

محبت کی آتش سے اخگر ہے دل
محبت نہ ہووے تو پتھر ہے دل

محبت کو ہے اس گلستاں میں راہ
کلی کے دلوں تک میں بستی ہے چاہ

محبت ہی سے دل کو رو بیٹھیے
محبت میں جی مفت کھو بیٹھیے

محبت لگاتی ہے پانی میں آگ
محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ

محبت سے ہے انتظام جہاں
محبت سے گردش میں ہے آسماں

محبت سے رو آئے کیا کیا خلل
محبت سے جو ہو گیا سو جہول

محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو
محبت سے کیا کیا ہو ہرگز نہ ہو

محبت سے پروانہ آتش بجاں ۔ محبت سے بلبل ہے گرمِ فغاں

- -

- -

- -

زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار
غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار

عشق

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جاکر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہ نمک اس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا
واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ — یاں تبسم ہے زخمِ تر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے — کہیں یہ خوں چکاں شکایت ہے
تھا کسو دل میں نالۂ جانکاہ — ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ
تھا کسو کے پلک کی نمناکی — ہے کسو نالوں کی غمناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا

کہیں اندوہ یاں آگہ تھا — سوزش سینہ ایک جاگہ تھا
کہیں عشاق کا نیاز ہوا — کہیں اندوہِ جاں گداز ہوا
تھی کہیں دل جگر کی بیتابی — تھا کسو مضطرب کی بیخوابی
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا — کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا
طور پر جا کے شعلہ پیش رہا — بیستوں میں شرار تیشہ رہا
کہیں نے بت کو لگائی آگ — کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ
کبھو افغانِ مرغِ گلشن تھا — کبھی قمری کا طوقِ گردن تھا

- -

- -

خار خارِ دلِ غریباں ہے — انتظارِ بلا نصیباں ہے
کہیں زخمِ سینہ ریشاں ہے — کہیں پاسِ سرِ گریباں ہے
کام میں اپنے عشق پکا ہے — ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہے
جس کو ہو اس کا التفات نصیب — ہے وہ مہمان چند روزہ غریب
ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

عشق

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق — حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ — عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں — ہے محمد کہیں علی ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق کیا کیا مصیبتیں لایا — روز کو رات کر کے دکھلایا
عشق بسر تا قدم امید ہوا — زیر تیغ ستم شہید ہوا
عشق سے رنگ زرد ہوتا ہے — عشق سے دل میں درد ہوتا ہے
عشق لایا ہے آفتیں کیا کیا — اس سے آئیں قیامتیں کیا کیا
قیس کیا رنج کھینچ کھینچ موا — سر پہ فرہاد کے سنا جو ہوا
عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں — آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں
عشق میں ایک جی کو کھو بیٹھے — ایک آنکھوں کو رو کے رو بیٹھے
شان ارفع ہے جن کی خوار ہیں یاں — عقل والے جنوں شعار ہیں یاں

خستۂ عشق کچھ نہ تیر ہوئے
بادشاہ عشق میں فقیر ہوئے

غزلیات

غزل

دل رفتۂ جمال ہے اُس ذوالجلال کا — مستجمع جمیع صفات و کمال کا
ادراک کو ہے ذاتِ مقدس میں دخل کیا — اُودھر نہیں گزار گمان و خیال کا
حیرت ہے عارفوں کو نہیں راہِ معرفت — حال اور کچھ ہے یاں اُنھوں کے مقال و قال کا
ہے قسمت زمین و فلک سے غرض نمود — جلوہ وگرنہ سب میں ہے اُس کے جمال کا

مرنے کا بھی خیال رہے میرؔ اگر تجھے
ہے اشتیاق جانِ جہاں کے وصال کا

غزل

ہے حرفِ خامہ دل زدۂ حُسنِ قبول کا — یعنی خیال سر میں ہے نعتِ رسول کا
رہ پیروی میں اس کی کہ جامِ نخست میں — ظاہر اثر ہے مقصدِ دل کی وصول کا
وہ مقتدا ہے خلقِ جہاں اب نہیں ہوا — پہلے ہی تھا امام نفوس و عقول کا
سرمہ کیا ہے وضع پہ چشمِ اہلِ قدس — احمدؐ کی رہگذار کی خاک اور دھول کا

حاصل ہے میرؔ دوستیِ اہلِ بیت اگر
تو غم ہے کیا نجات کی اپنی حصول کا

غزل

کل چمن میں گل و سمن دیکھا — آج دیکھا تو باغ بن دیکھا
کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں — عاشقوں کا جلا وطن دیکھا
ذوق پیکان تیر میں تیرے — ناتواں تک جگر سے چھن دیکھا
ایک چشمک دو صد سنان مژہ — اس نکیلے کا بانکپن دیکھا

حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ
میر کا کھول کر کفن دیکھا

غزل

دل جو زیر غبار اکثر تھا — کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
اس پہ تکیہ کیا تو تھا لیکن — رات دن ہم تھے اور بستر تھا
سرسری تم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا
بار سجدہ ادا کیا تہ تیغ — کب سے یہ بوجھ میرے سر پر تھا
اب خرابہ ہوا جہان آباد — ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

غزل

نکتہ مشتاق یار ہے اپنا — شاعری تو شعار ہے اپنا
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور
اس میں کیا اختیار ہے اپنا

کچھ نہیں ہم مثال عنقا لیک
شہر شہر اشتہار ہے اپنا

ہرگز آزار میر میں نہ کرو
خستہ اپنا ہے زار ہے اپنا

غزل

یار ہے میر کا مگر گل سا
کہ سر نالہ کش ہے بلبل سا

یاں کوئی اپنی جان دو دشوار
واں وہی ہے سو ہے تساہل سا

اک نگہ ایک چشمک ایک سخن
اس میں بھی تم کو ہے تامل سا

درد دل کو ہمارے کیا دیکھو
ہو چکی ہو چکی اب ہے تامل سا

اونکی زنجیر پا سے میر کے
رات سنتے رہے ہیں ہم غل سا

غزل

آہ سحر نے سوزش دل کو مٹا دیا
اس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا

سمجھی نہ باد صبح کہ آ کر اٹھا دیا
اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

تھی لاگ اس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے
دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا

سب شور ما و من کو لیے سر میں مر گئے
یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں　　مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا
کیا کچھ نہ تھا ازل میں نہ طالع تھے جو درست　　ہم کو دلِ شکستہ قضا نے دلا دیا

شکایت دردِ دل کی جو شب ہم نشیں سے کی
دردِ سخن نے میر سبھوں کو رلا دیا

غزل

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا　　اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا
اک گرد راہ تھی پئے محمل تمام راہ　　کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا
دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں　　واں چیں جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا
مانندِ حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا　　دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا
گزری مدام اس کی جوانانِ مست میں　　پیرِ مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

غزل

کل شبِ ہجراں تھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا
شام سے تا صبح دمِ بالیں پہ سر یک جا نہ تھا
منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہم نشیں
اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا

اِک نگاہِ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں
وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا

یاد آیا ہے کہ اپنی روز و شب کی جائے باش
یا درِ یار اور بیاباں۔ یا درِ میخانہ تھا

شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست
شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

جس کو دیکھا ہم نے اس وحشت کدے میں دہر کے
یا سڑی یا خبطی یا مجنون یا دیوانہ تھا

میر بھی کیا مست طافح تھا شرابِ عشق کا
لب پہ عاشق کے ہمیشہ نعرۂ مستانہ تھا

غزل

ستم کہ عہد میں دورِ سبو تھا — پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ — کہ ہر غنچہ دلِ پُر آرزو تھا
گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا — جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا
مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا — کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

غزل

سن مشتاق ہے عالم ہمارا   شہرت ہے جہاں میں دم ہمارا
ہے جو کچھ عالم ہستی [illegible] اکثر   رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا
[illegible] کرو ہو پاس کچھ تو کم ہمارا
[illegible] ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میرؔ
یہیں شاید کہ ہے سب غم ہمارا

غزل

غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا   ہونٹھ پر رنگ پان ہے گویا
مرے مرنے سے بھی وہ چونکے ہے   اب تلک مجھ میں جان ہے گویا
چاہیے چپکے گزرے اس کا نام   منہ میں جب تک زبان ہے گویا
سرسری کہیں ہے ایک وہ پرکار   دیکھو تو مہربان ہے گویا
حیرت روے گل سے مرغ چمن   چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا
[illegible] ایسی بھری بھری کب ہے   [illegible] کدہ اک جہان ہے گویا
بسکہ ہیں اس غزل میں شعر بلند   یہ زمیں آسمان ہے گویا

[illegible] شیب میں [illegible]
میرؔ اب تک جوان ہے گویا

غزل

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا | عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے | چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے | ہشیار زینہار خبردار دیکھنا
صیاد دل ہے داغ جدائی سے رشک باغ | تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

اس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میر
جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار دیکھنا

غزل

جب جنوں سے ہمیں توسل تھا | اپنی زنجیر پا ہی کا غل تھا
بسترا تھا چمن میں جوں بلبل | نالہ سرمایۂ توکل تھا
یک نگہ کو وفا نہ کی گویا | موسم گل صفیر بلبل تھا
ان نے پہچان کر ہمیں مارا | منہ نہ کرنا ادھر تجاہل تھا
شہر میں جو نظر پڑا اس کا | کشتۂ ناز یا تغافل تھا
اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار | یاد ایام جب تحمل تھا

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقت خوش میر نکہت گل تھا

غزل

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

کب بندگی میری سی بندہ کرے گا کوئی
جانے ہے خدا اس کو۔ میں تم کو خدا جانا

اس شمع کی مجلس میں جانا ہمیں پھر واں سے
اک زخم زباں تازہ ہر روز اٹھا جانا

باقی ہے گزرنی جی پہ اس وقت قیامت کی
یاد آوے ہے جب تیرا یکبار کی آ جانا

کب میر ابر آئے تم ویسے فریبی سے
دل کو تو لگا بیٹھے لیکن نہ لگا جانا

غزل

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا — جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک — سر سے سودائے جستجو نہ گیا
سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں — لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا
دل میں کتنے مسودے تھے ولے — ایک پیش اس کے رو برو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

غزل

آگے تو رسم دوستی کی تھی جہاں کے بیچ
اب کیسے لوگ آئے زمیں آسماں کے بیچ

میں بے دماغ عشق اُٹھا سو چلا گیا
بلبل پکارتی ہی رہی گلستاں کے بیچ

ٹک دیکھ چلنے کی سبک روئی نگاہ کر
ہستی کو اپنی سوچ لیا آب رواں کے بیچ

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب
آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

اس روئے بر فروختہ سے جی ڈرے ہے میر
یہ آگ جا لگے گی کسو دودماں کے بیچ

غزل

عشق میں اے طبیب یاں ٹک سوچ
پاس جاں درمیاں ہے یاں ٹک سوچ

سرسری مست جہاں سے جا غافل
پاؤں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ

کھیل اتنا پڑا ہے کیوں یاں تو
پار اگلے گئے کہاں ٹک سوچ

ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن
یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ

گل و رنگ و بہار پردے ہیں
ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ

فائدہ سر جھکے کا شیب میں میر
پیری سے آگے اے جواں ٹک سوچ

غزل

آئے گی اپنے کیا کہیں اس گلستاں کی طرح
ہر گام پر تلف ہوئے آبِ رواں کی طرح

یہ شور دلخراش کب اٹھتا تھا باغ میں
سیکھے ہیں عندلیب بھی ہم سے فغاں کی طرح

نقشہ الٰہی دل کا مرے کون لے گیا
کہتے ہیں سارے عرش میں ہے اس مکاں کی طرح

مرغِ چمن نے روز رولایا سبھوں کے تئیں
میری غزل پڑھی تھی شب اک روضہ خواں کی طرح

یہ باتیں رنگ رنگ ہماری ہے ورنہ میر
آجاتی ہے کلی میں کبھو اس دہاں کی طرح

غزل

دور گردوں سے ہوئی کچھ اور میخانے کی طرح
بھر نہ آویں کیونکہ آنکھیں میری پیمانے کی طرح

آنکلتا ہے کبھو ہنستا تو ہے باغ و بہار
اس کی آمد میں ہے ساری فصلِ گل آنے کی طرح

آج کچھ شہر دنیا کی کیا خرابی ہے نئی
عشق نے مدت سے یاں ڈالی ہے ویرانے کی طرح

کس طرح جی سے گزر جاتے ہیں آنکھیں موند کر
دیدنی ہے دردمندوں کی بھی مر جانے کی طرح

یوں کبھی سر پہ دھنتا ہے اے ناصح کوئی مجھ سے کہہ بائے
اپنے دیوانے کو سمجھاتے ہیں سمجھانے کی طرح
جان کا صرفہ نہیں ہے کچھ تجھے کرتے ہیں میرؔ
غم کوئی کھاتا ہے میری جان غم کھانے کی طرح

غزل

نہ پڑھا خط کو یا پڑھا قاصد آخرِ کار کیا کہا قاصد
کوئی پہنچا نہ خط مرا اُس تک میرے طالع ہیں نارسا قاصد
گر پڑا خط تو تجھ پہ حرف نہیں یہ بھی میرا ہی تھا لکھا قاصد
کشتہ قصہ لکھا کروں تا کے بھیجا کب تک کروں نیا قاصد
ہے طلسمات اُس کا کوچہ تو جو گیا سو وہیں رہا قاصد
نامۂ میرؔ کو اُڑاتا ہے
کاغذِ باد ہو گیا قاصد

غزل

میرے سنگِ مزار پہ فرہاد رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد
ہم سے بِن مرگ کیا جُدا ہو ملال جان کے ساتھ ہے دلِ ناشاد
فکرِ تعمیر میں نہ رہ مُنعم زندگانی کی کچھ بھی ہے بنیاد
خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
سُنتے ہو ٹک سُنو کہ پھر مجھ بعد نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد

ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز　　باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد
خوب ہی خاک سے بزرگوں کی　　چاہنا تو مرے تئیں امداد
پر مروت کہاں کی ہے اے میر　　تو ہی مجھ دل جلے کو کر ارشاد
نامرادی ہو جس پہ پروانہ
وہ جلاتا پھرے چراغِ مراد

غزل

بزم میں منہ اِدھر کریں کیونکر　　اور نیچی نظر کریں کیونکر
یوں بھی مشکل ہے وہاں بھی مشکل ہے　　سر جھکائے گزر کریں کیونکر
راز پوشیِ عشق ہے منظور　　آنکھیں رو رو کے تر کریں کیونکر
مست و بیخود ہم اُس کے در پہ گئے　　لوگ اس کو خبر کریں کیونکر
دل نہیں دردمند اپنا میر
آہ و نالے اثر کریں کیونکر

غزل

مرتے ہیں ہم تو آدمِ خاکی کی شان پر　　اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر
اُس کامِ جاں کے جلوۂ نکا میں ہیں بلا کی　　آفت عجب طرح کی ہے سارے جہان پر
تقدیسِ دل تو دیکھ ہوئی دل کو جس سے راہ　　سر دے ہیں لوگ اُس کے قدم کے نشان پر
آفات میں ہے مرغِ چمن گل کے شوق سے　　جو کھِن ہزار رنگ کے رہتے ہیں جان پر
شوخی تو دیکھو آپ ہی کہا آؤ بیٹھو میر　　پوچھا کہاں تو بولے کہ میری زبان پر

غزل

دعویٰ ہے یوں ہی اس کا ترے حُسن گوش پر
یاں کون تھوک کے ہے صدفِ ہرزہ کوش پر

شاید کسو میں اس میں بہت ہوگیا ہے بُعد
تُم بھی تو گوش رکھو جرس کے خروش پر

اِک شور ہے جو عالم کون و فساد میں
ہنگامہ ہے اُسی کے یہ لعلِ خموش پر

ہے بار دوش جس کے لیے زندگی سو وہ
رکھ ہاتھ راہ تک نہ چلا میرے دوش پر

جو ہے سو مست بادۂ وہم و خیال ہے
کس کو ہے یاں نگاہ کسو درد نوش پر

مُرغِ چمن نے کیا حق صحبت ادا کیا
لا لا کے گُل بکھیرے مرے قبر پوش پر

جب تک بہار رہتی ہے رہتا ہے مست تو
عاشق ہیں میرؔ ہم تو ترے عقل و ہوش پر

غزل

ہم بھی پھرتے ہیں اک حشم لے کر
دستۂ داغ و فوجِ غم لے کر

دست کش نالہ پیش رو گریہ
آہ چلتی ہے یاں علم لے کر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اس کے اوپر کہ دل سے تھا نزدیک
غمِ دوری چلے ہیں ہم لے کر

صنعت یاں تک کھچا کہ صورت گر
رہ گئے ہاتھ میں قلم لے کر

دل پہ کب اکتفا کرے ہے عشق
جائے گا جان بھی یہ غم لے کر

میر صاحب بھی چوکے اسے بدعہد
ورنہ دینا تھا دل قسم لے کر

غزل

شیخ کا اب کمال ہے کچھ اور
حال ہے اور قال ہے کچھ اور

سہل مت بوجھ یہ طلسمِ جہاں
ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور

نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں
عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور

اس میں اس میں بڑا تفاوت ہے
کبک کی چال ڈھال ہے کچھ اور

میر تلوار چلتی ہے تو چلے
خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور

غزل

گلہ مت توڑ اپنا اے جرس بس — نہیں اس راہ میں فریاد رس بس
کبھو دل کی نہ کہنے پائے اس سے — جہاں بولے لگا کہنے کہ بس بس
گل و گلزار سے کیا قیدیوں کو — ہمیں داغ دل و کنج قفس بس
کسو محبوب کے ہو گور پر گل — ہماری خاک کو ہے خار و خس بس

چمن کے غم میں سینہ داغ ہے میر
بہت نکلے ہمارے بھی ہوس بس

غزل

آنکھ کھلتے گئی بہار افسوس — گل کو دیکھا بھی نہ ہزار افسوس
نہ مروت نہ آشنا کوئی — ہم ہیں بے یار و بے دیار افسوس
خوں ہوئے دل ہی میں امید وصال — مر رہے جی کو مار مار افسوس
چارۂ اشتیاق کچھ نہ ہوا — وہ نہ ہم سے ہوا دوچار افسوس

منتظر ہی رہے ہم اس کے میر
یاں تک آیا کبھی نہ یار افسوس

غزل

فکر ہیں مرگ کے ہوں سر پہ درپیش — [illegible] کا سفر درپیش
کس کی آنکھیں پھری ہیں آنکھوں میں — وہ ہم سے ہے مری نظر درپیش
[illegible] — [illegible] درپیش

کیا کروں نقلِ راہِ ہستی میں مرحلے آئے کس قدر درپیش
کیا پتنگے کو شمع روئے میرؔ
اس کی شب کو بھی ہے سحر درپیش

غزل

کیا کہئے کیا رکھیں ہیں ہم تجھ سے یار خواہش
یک جان صد تمنا یک دل ہزار خواہش
لے ہاتھ میں قفس ٹک صیاد چل چمن تک
مدت سے ہے ہمیں بھی سیرِ بہار خواہش
نے کچھ گنہ ہے دل کا نے جرم چشم اس میں
رکھتی ہے ہم کو اتنا بے اختیار خواہش
حالانکہ عمر ساری مایوس گزری تس پر
کیا کیا رکھے ہیں اس کے امیدوار خواہش
صد رنگ جلوہ گر ہے ہر جا وہ غیرتِ گل
عاشق کی ایک جا سے کیونکر قرار خواہش
کرتے ہیں سب تمنا پر میرؔ جی نہ اتنی
رکھے گی مار تم کو پایانِ کار خواہش

غزل

ہے مری ہر اک غزل پر اجتماع خانقہ میں کرتے ہیں صوفی سماع

وجد میں رکھتا ہے اہلِ فہم کو ۔۔۔ میری شعر و شاعری کا استماع
نیم بسمل چھوڑ دینا رسم کر ۔۔۔ اس شکارِ افگن کا ہے گا اختراع
دل جگر خوں ہو کے رخصت ہو گئے ۔۔۔ حسرت آلودہ ہے کیا اشکِ وداع
میرؔ دردِ دل نہ کہہ ظالم بس اب
ہو گیا ہے سامعوں کو تو صداع

غزل

اب نہیں سینے میں میرے جائے داغ ۔۔۔ سوزِ دل سے داغ ہے بالائے داغ
دل جلا آنکھیں جلیں جی جل گیا ۔۔۔ عشق نے کیا کیا ہمیں دکھلائے داغ
دل جگر جل کر ہوئے ہیں دونوں ایک ۔۔۔ درمیاں آیا ہے جب سے پائے داغ
منفعل ہیں لالہ و شمع و چراغ ۔۔۔ ہم نے بھی کیا عاشقی میں کھائے داغ
وہ نہیں اب میرؔ جو چھاتی جلے
کھا گیا سارے جگر کو ہائے داغ

غزل

کیا پیام و سلام ہے موقوف ۔۔۔ رسم ظاہر تمام ہے موقوف
حیرتِ حسنِ یار سے چپ ہیں ۔۔۔ سب سے حرف و کلام ہے موقوف
روز وعدہ ہے ملنے کا لیکن ۔۔۔ صبح موقوف شام ہے موقوف
وہ نہیں ہے کہ داد لے چھوڑیں ۔۔۔ اب ترحم پہ کام ہے موقوف
اقتدا میرؔ ہم سے کس کی ہوئی ۔۔۔ اپنے ہاں اب امام ہے موقوف

غزل

گر بادیے میں تجھ کو صبا لے کے جائے شوق
مجنوں کو میری اور سے کہیو دعائے شوق

ہر چار اور اڑتی پھرے ہے ہماری خاک
سر سے گئی نہ جی بھی گئے پر ہوائے شوق

دیر و حرم میں ہم کو پھرایا ہے دیر تک
پھرتی ہمارے ساتھ وہی ہے ادائے شوق

درد اور آہ و نالہ کرے ہے وہم تشنہ
یک مشت پر ہے مرغ گلستان ہائے شوق

کیا پوچھتے ہو شوق کہاں تک ہے ہم کو میر
مرنا ہی اہل درد کا ہے انتہائے شوق

غزل

طریق عشق میں ہے رہنما دل
پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

اسیری میں تو کچھ واشد کبھو تھی
رہا غمگیں ہوا جب سے رہا دل

خموشی مجھ کو حیرت سے ہے ورنہ
پھرے ہیں لب سے لیکر گفتگو تا دل

ہوا پژمردہ و بے صبر و بے تاب
کرے گا اس طرح کب تک وفا دل

ہوئی پروا نہ واں دلبر کو یاں میر
اٹھا کر ہو چکا جور و جفا دل

غزل

مدت تو وا ہوا ہی نہ یہ غنچہ وار دل
اب جو کھلا تو جیسے گل بے بہار دل

ہے غم میں یاد کس کو فراموش کار دل
اب آ بنی ہے جی پہ رہا در کنار دل

وہ کون سی امید بر آئی ہے عشق میں
رہتا ہے کس امید پہ امیدوار دل

اہل بادہ عشرت کے ہوتے ہیں مجبور ہیں سبھی   کھینچتا ہے اس کی اور کو بے اختیار دل
ہم سے جو عشق کشتہ جئیں تو عجب ہے میر
چھاتی ہے داغ ٹکڑے جگر کے فگار دل

غزل

ہے تہِ دل بتوں کا کیا معلوم   نکلے پردے سے کیا خدا معلوم
یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے   سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم
علم سب کو ہے یہ کہ سب تو ہے   پھر ہے اللہ کیسا نا معلوم
گرچہ تو ہی ہے سب جگہ لیکن   ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم
عشق جانا تھا مار رکھے گا   ابتدا میں تھی انتہا معلوم
طرز کینے کی کوئی چھپتی ہے
مدعی کا ہے مدعا معلوم

غزل

کچھ نہ پوچھو بہک رہے ہیں ہم   عشق کی مے سے چھلک رہے ہیں ہم
سوکھ غم سے ہوئے ہیں کانٹا سے   پر دلوں میں کھٹک رہے ہیں ہم
وقفۂ مرگ اب ضروری ہے   عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم
کیونکر دعا کو ہاتھ اٹھ سکے   دامن دل جھٹک رہے ہیں ہم
کون پہنچے ہے بات کی تہ کو
ایک مدت سے بک رہے ہیں ہم

غزل

کرتے ہیں جو کہ جی میں ٹھانے ہیں　　خوبرو کس کی بات مانے ہیں
ہیں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں　　پر مجھے یہ بھی خوب جانے ہیں
چاہیں ہیں اس گلی میں گھر رہنا　　ضعف و بے طاقتی بہانے ہیں
قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور　　اب مرے عہد میں فسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

غزل

گو کہ تنہا نے جا رہا ہوں میں　　بخدا باخدا رہا ہوں میں
سب گئے دل دماغ و تاب و تواں　　میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں
برق تو میں نہ تھا کہ جل بجھتا　　ابر تر ہوں کہ چھا رہا ہوں میں
اس کی بیگانہ وضعی ہے معلوم　　برسوں تک آشنا رہا ہوں میں
دیکھوں کب تیغ اس کی آ بیٹھے　　دیر سے سر اٹھا رہا ہوں میں
مجھ کو بد حال رہنے دیں اے کاش　　سب دوا کچھ چھڑا رہا ہوں میں

شعر کچھ رہا ہی نہیں ہے مجھ میں میر
جب سے ان سے جدا رہا ہوں میں

غزل

شرمندہ حبیب ظلم و ستم و جور و جفا ہوں　　ہر چند کہ جلتا ہوں پہ سرگرم وفا ہوں

اس گلشنِ دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں — ہوں غنچۂ افسردہ کہ مردودِ صبا ہوں
بے چشم ہے ہر آبلۂ پا کا مرا اشک — از بسکہ تری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں
دامن نہ جھٹک ہاتھ سے میرے کہ ستمگر — ہوں خاک سرِ راہ کوئی دم میں ہوا ہوں
گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب — بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں
تب گرم سخن کہنے لگا ہوں میں کہ اک عمر — جوں شمع سرِ شام سے تا صبح جلا ہوں

سینہ تو کیا فضلِ الٰہی سے سبھی چاک
ہے وقتِ دعا میر کہ اب دل کو لگا ہوں

غزل

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا — اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وہ معنی — اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو و لیکن معدود جانتے ہیں

مر کر بھی ہاتھ آوے تو میر مفت ہے وہ
جی کے زیان کو بھی ہم سود جانتے ہیں

غزل

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے وہ دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ رواں ہوں
تکلیف نہ دے آہ مجھے جنبشِ لب کی
میں صد سخنِ آغشتہ بخوں زیرِ زباں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
در پے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں
خوش باشی و تنزیہ و تقدس تھی مجھے میر
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں

غزل

مستعد کاش مجلسِ گل ہو — درمیاں تو ہو سامنے گل ہو
گر یہاں مستقل رہیں باہم — نے تساہل ہو نے تغافل ہو
نہ تو مانع نہ جذبہ پھر دل کا — کس بھروسے پہ تنک تحمل ہو
آدھ جلا لالہ ساں رہا تو کیا — داغ جب ہو تو کوئی بالکل ہو

دیر رہنے کی جا نہیں ہے یہ چمن   بوئے گل ہو صفیر بلبل ہو

منکشف ہو رہا ہے حالِ تمیر
کاش تک یار کو تامل ہو

غزل

اتنی نہیں تمھیں کہ ہمیں نا سزا کہو   پر ہے یہی ہمارے کیے کی سزا کہو
چپکے رہے بھی چین نہیں تب کہے ہے بول   لب بستہ بیٹھے رہتے ہو ہو مدعا کہو
اب نیک و بد بیچ عشق میں مجھ کو نظر نہیں   اس میں مجھے برا کہو کوئی بھلا کہو
صحبت ہماری اس کی جو ہے گفتنی نہیں   کیا کہئے گر کہے کوئی یہ ماجرا کہو

کب شرح شوق ہو سکے پر تو بھی تمیری
خط تم نے جو لکھا اسے کیا لکھا لکھا کہو

غزل

دل صاف ہو تو جلوہ گہ یار کیوں نہ ہو
آئینہ ہو تو قابل دیدار کیوں نہ ہو

مستغنیانہ تو جو کرے پہلے ہی سکوت
عاشق کو فکر عاقبت کار کیوں نہ ہو

رحمت غضب میں نسبت برق و سحاب ہے
جس کو شعور ہو تو گنہگار کیوں نہ ہو

ہر دم کی تازہ مرگِ جدائی سے تنگ ہوں
ہونا جو کچھ ہے آہ سو یکبار کیوں نہ ہو

گلگشت کا بھی لطف دل خوش سے ہے نسیم
پیشِ نظر وگرنہ چمن زار کیوں نہ ہو

موئے سفید ہم کو کہے ہے کہ غافلاں
اب صبح ہونے آئی ہے بیدار کیوں نہ ہو

نزدیک اپنے ہم نے تو سب کر رکھا ہے سہل
پھر میرؔ اس میں مُردنِ دشوار کیوں نہ ہو

غزل

اب وہ ہوا ہے اتنا کہ جور و جفا کرے
افسوس ہے جو عمر نہ میری وفا کرے

ہجرانِ یار ایک مصیبت ہے ہمنشیں
مرنے کے حال سے کوئی کب تک جیا کرے

مستی شراب کی ہی سی ہے آمدِ شباب
ایسا نہ ہو کہ تم کو جوانی نشا کرے

برسوں کیا کرے مری تُربت کو گلفشاں
مُرغِ چمن اگر حقِ صحبت ادا کرے

عارف ہے میرؔ اس سے ملا بیشتر کرو
شاید کہ وقت خاص میں تم کو دعا کرے

غزل

ہم پہ چشم و خطاب ہے سو ہے	وہی ناز و عتاب ہے سو ہے
گر پہ گھبرا کے لب پہ آئی ولے	جان کو اضطراب ہے سو ہے
بس گئی جاں خراب مدت کی	حال اپنا خراب ہے سو ہے
دشمنِ جاں تو ہے دلوں میں ہم	دوستی کا حساب ہے سو ہے

شہر میں در بدر پھرے ہیں عزیز
میرؔ ذلت مآب ہے سو ہے

غزل

دل عجب نسخۂ تصوف ہے	ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے
آپ ہی صرفِ عشق ہو جانا	یہ بھی درویش کا تصرف ہے
یاں تو تکلیف سی کبھی تکلیف	واں وہی اب تلک تکلف ہے
چھیڑ اس شوخ نے رکھی ہم سے	عہد پر عہد ہے تخلف ہے

مرگ کیا منزلِ مراد ہے میرؔ
یہ بھی اک راہ کا توقف ہے

غزل

ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے		آسمان تک سیاہ کرتے تھے
اے خوشا حال اس کا جس کا وے		حال عمداً تباہ کرتے تھے
برسوں رہتے تھے راہ میں اس کی		تب کچھ اک اس سے راہ کرتے تھے
ہے جوانی کہ موسمِ گل میں		جائے طاعت گناہ کرتے تھے

کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا میر
ہم دگر لوگ چاہ کرتے تھے

غزل

دہر بھی میر طرفہ مقتل ہے		جو ہے سو کوئی دم کو فیصل ہے
کثرتِ غم سے دم لگا رکنے		حسرتِ دل میں آج دنگل ہے
چھوڑ مت نقدِ وقت نسیہ پر		آج جو کچھ ہے سو کہاں کل ہے
بند ہو تجھ سے یہ کھلا نہ کبھو		دل ہے یا خانۂ مقفل ہے

سینہ چاکی بھی کام رکھتی ہے
یہی کر جب تلک معطل ہے

غزل

نہیں وسواس جی گنوانے کے		ہائے رے ذوق دل لگانے کے

میرے تغییرِ حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے
دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھے بہانے کے
اس کدورت کو ہم سمجھتے تھے — ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے
بس ہیں دو برگِ گل قفس میں صبا — نہیں بھوکے ہم آب و دانے کے
اب گریباں کہاں کہ اے ناصح — چڑھ گیا ہاتھ اُس دوانے کے
دل و دیں ہوش و صبر سب ہی گئے
آگے آگے تمھارے آنے کے

غزل

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگِ صوت جرس تجھ سے دور ہوں تنہا — خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری
شب اُس کے کوچے میں جاتا ہوں اتّقیہ پر — کہ ایک دوست ہے واں خواب پاسباں میری
اُسی سے دور رہا اصل مدعا جو تھا — گئی یہ عمرِ عزیز آہ رائگاں میری
ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا — گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری
رہا میں در پسِ دیوارِ باغ مدت لیک — گئی گلوں کے نہ کانوں تلک فغاں میری
ہوا ہوں گریۂ خونیں کا جب سے دامنگیر — نہ آستین ہوئی پاک دوستاں میری
دیا دکھائی مجھے تو اُسی کا جلوہ میرؔ
پڑی جہان میں جا کر نظر جہاں میری

غزل

تن ہجر میں اس یار کے رنجور ہوا ہے — بے طاقتی دل کو بھی مقدور ہوا ہے
پہنچا نہیں کیا سمع مبارک میں مرا حال — یہ قصہ تو اس شہر میں مشہور ہوا ہے
بے خوابی تری آنکھوں پہ دیکھوں ہوں مگر رات — افسانہ مرے حال کا مذکور ہوا ہے
خورشید کی محشر میں طپش ہوگی کہاں تک — کیا ساتھ مرے داغوں کے محشور ہوا ہے

اس شوق کو ٹک دیکھ کہ چشم نگراں ہے
جو زخم جگر کا مرے ناسور ہوا ہے

غزل

دشمنوں کے روبرو دشنام ہے — یہ بھی کوئی لطف بے ہنگام ہے
محو زلف یار ہے عالم تمام — حسن کا شہرہ بھی جوش شام ہے
روز و شب پھرتا ہوں اس کوچے کے گرد — کیا کہوں کیا گردش ایام ہے
عشق کی ہے راہ کیا مشکل گزر — سر کا جانا جس میں اک گام ہے

بزم میں پوچھا تو یوں انجان ہو
میر ان لوگوں میں کس کا نام ہے

غزل

یار بن تلخ زندگانی تھی — دوستی مدعی جانی تھی

سر سے اس کے ہوا گئی نہ کبھو — عمر برباد یوں ہی جانی تھی
لطف پر اس کے ہمنشیں مت جا — کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی
شیب میں فائدہ تامل کا — سوچنا تب تھا جب جوانی تھی
عاشقی جی ہی لے گئی آخر — یہ بلا کوئی ناگہانی تھی
اس رخِ آتشیں کی شرم سے رات — شمعِ مجلس ہیں پانی پانی تھی

فقر پر بھی تھا میر کے اک رنگ
کفنی پہنی سو زعفرانی تھی

غزل

نالۂ عجز نقصِ الفت ہے — رنج و محنت کمالِ راحت ہے
تا دمِ مرگ غم خوشی کا نہیں — دلِ آزردہ گر سلامت ہے
رونا آتا ہے دم بدم شاید — کسو حسرت کی دل سے رخصت ہے
نہ تجھے رحم نے اسے ٹک صبر — دل پہ میرے عجب مصیبت ہے

تجھ کو مسجد ہے مجھ کو میخانہ — واعظا اپنی اپنی قسمت ہے
ایسے ہنس مکھ کو شمع سے تشبیہ — شمعِ مجلس کی رونی صورت ہے

تربتِ میر پر ہیں اہلِ سخن — ہر طرف حرف ہے حکایت ہے
تو بھی تقریبِ فاتحہ سے چل — بخدا واجب الزیارت ہے

غزل

کلی کہتے ہیں اس کا سا دہن ہے ۔ سُنا کر یہ کہ یہ بھی اک سخن ہے
ٹپکتے درد ہیں آنسو کی جا گہ ۔ الٰہی چشم یا زخمِ کہن ہے
شہادت گاہ ہے باغِ زمانہ ۔ کہ ہر گُل اس میں اک خونیں کفن ہے
کروں کیا حسرتِ گُل کو وگرنہ ۔ دلِ پُر داغ بھی اپنا چمن ہے

جو دے آرام ٹک آوارگی میر
تو شامِ غربت اِک صُبحِ وطن ہے

غزل

عہدِ جنوں ہے موسمِ گُل کا اور شگوفہ لایا ہے
ابرِ بہاری وادی سے اُٹھ کر آبادی پر آیا ہے
سُن کر میری شورش کو جھنجھلا کر وہ یہ کہنے لگا
نالے اِس کے فلک تک پہنچے کن نے اِس کو ستایا ہے
برسوں ہم درویش رہے ہیں پردے میں دنیاداری کے
ناموس اِس کے کیونکہ رہے یہ پردہ جن نے اُٹھایا ہے
ڈھونڈھ نکالا تھا جو اُسے سو آپ کو بھی ہم کھو بیٹھے
جیسا نہال لگایا ہم نے ویسا ہی پھل پایا ہے

بے چشم و رو ہو بیٹھے ہو وجہ نہیں ہے ظاہر کچھ
کام کی صورت بگڑی ہماری منہ کیوں تم نے بنایا ہے
میر غریب سے کیا ہے معارض گوشے میں اس وادی کے
ایک دیا سا بجھتا اُن نے داغ جگر پہ جلایا ہے

غزل

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے — خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے
نہیں عشق کا درد لذت سے خالی — جسے ذوق ہے وہ مزا جانتا ہے
ہمیشہ دل اپنا جو بیجا ہے اُس بن — مرے قتل کو وہ بجا جانتا ہے
مجھے جانے ہے آپ ہی سا فریبی — دعا کو بھی میری دغا جانتا ہے
جفا اُس پہ کرتا ہے حد سے زیادہ — جسے یار اہل وفا جانتا ہے
مرے دل میں رہتا ہے تو ہی تب ہی تو — جو کچھ دل کا ہے مدعا جانتا ہے

جہاں میر عاشق ہوا خوار ہی تھا
یہ سودائی کب دل لگا جانتا ہے

غزل

داد فریاد جا بجا کریے — شاید اس کے بھی دل میں جا کریے
دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت — گالیاں کھائیے دعا کریے

کچھ کہیں تو کہے ہے یہ نہ کہو کیونکر اظہار مدعا کریے
راہ تکنے کو بھی نہایت ہے منتظر کب تلک رہا کریے
وہ نہیں سرگذشت سنتا میر
یوں کہانی سی کیا کہا کریے

غزل

گئے جی سے چھوٹے بتوں کی جفا سے
یہی بات ہم چاہتے تھے خدا سے
وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں
مرو یا جیو کوئی اس کی بلا سے
نہ رکھی مری خاک بھی اس گلی میں
کدورت مجھے ہے نہایت صبا سے
جگر سوئے مژگاں کھنچا جائے ہے کچھ
مگر دیدۂ تر ہیں لوہو کے پیاسے
اگر چشم ہے تو وہی عین حق ہے
تعصب تجھے ہے عجب ماسوا سے
طبیبِ سبک عقل ہرگز نہ سمجھا
ہوا دردِ عشق آہ دونا دوا سے

ٹک اے مدعی چشمِ انصاف وا کر
کہ بیٹھے ہیں یہ قافیے کس ادا سے
نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میر جی آج کیوں ہو خفا سے

غزل

دیکھو تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا۔
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک — شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا۔
خانۂ دل سے زینہار نہ جا — کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا۔
شمعدان سے لگے گھر کی بھی۔ شعلۂ آواز — دود کچھ آشیاں سے اٹھتا۔
بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو — جو تری آستاں سے اٹھتا۔

عشق اک میر بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

تمام شد

نیشنل پریس الہ آباد میں باہتمام رمضان علی شاہ چھپا

DUE DATE